خطباتِ مُشران

بزم چہارم

یعنی

آنجہانی پنڈت سُندر نراین مُشران

رئیس فرّخ آباد کے چند خطبے

مع مقدمہ

از شاعرِ حرّیت جناب نسیم امروہوی

مشمولۂ امتحان

ادیبِ کامل - جامعۂ اُردو - آگرہ

خطباتِ مُشران

بزم چہارم

یعنی

آنجہانی پنڈت سندر نراین مشران

رئیس فرخ آباد کے چند خطبے

مع مقدمہ

ازشاعرِ حریت جنابِ نسیم امروہوی

مشمولۂ

نصاب "ادیب کامل"، جامعۂ اردو۔ آگرہ

قیمت عہ ۱۱؍

فہرست مضامین

۱ - "شہیدِ ادب" ۱
۲ - مقدمہ ۷
۳ - شعرار کا خیر مقدم اور — شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ ۱
۴ - سرسید میموریل فنڈ ۲۶
۵ - ہندو مسلم اتحاد ۳۶
۶ - حاضرین مشاعرہ کا خیر مقدم آداب شاعری اور حالات شعرا ۴۶
۷ - گوکھلے کا غم ۶۵
۸ - بشن نراین در کا ماتم ۷۳
۹ - محفل مشاعرہ میں حاضرین کی ضیافت طبع ۷۸
۱۰ - رامائن پر ایک نظر ۸۶
۱۱ - علمائے اسلام کا شکریہ ۹۱
۱۲ - موتی کی خدمت میں خیر مقدم کے ہار ۹۷
۱۳ - مصطفیٰ کمال پاشا کی فتح ۱۰۳
۱۴ - آموں کی نمایش ۱۱۱

"شہیدِ ادب"

پنڈت سُندر نراین صاحب مُشران

کے

مختصر حالاتِ زندگی

پنڈت سندر نراین مُشران ایم، آر، اے، ایس (لندن) فرخ آباد کے رئیس اور اُردو کے نامور خطیب اور ممتاز ادیب تھے۔ آپ کے والد پنڈت لچھمی نراین مُشران پسندیدہ خدمات کے صلے میں ملکہ وکٹوریہ کی سندِ خیر خواہی پائے ہوئے تھے اور آپ کے دادا پنڈت گوردھن داس مُشران کو (جو نواب تجمل حسین خاں بہادر، والی فرخ آباد کی سرکار میں مدارالمہام تھے) بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی سرکار سے "انتظام الدولہ، ممتاز الملک، مہاراجا گوردھن داس بہادر، دیوانِ اعلیٰ"، کا خطاب تھا۔ اُن کی اسناد میں تحریر ہے کہ فرخ آباد کے ضلع کا انتظامِ مالی، بعد غدر محض گوردھن داس کے مشورے سے کیا گیا ہے۔ پنڈت گوردھن داس کے بزرگ صوبہ دار کشمیر تھے لیکن کشمیر کی طوائف الملوکی کے زمانے میں ترکِ وطن کر کے فرخ آباد میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

شہیدِ ادب کو رفاہِ عام کے کاموں سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی۔ ۱۸۹۹ء میں آپ کی کوشش سے فرخ آباد میں ایک پبلک لائبریری قائم ہوئی۔ جس کی ترقی و بقا کے تمام سامان آپ نے اپنی حیات ہی میں فراہم کر دیے۔ جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو بتاریخ ۳۱، جولائی ۱۹۳۲ء لائبریری ہال میں ایک سنگ مرمر کی لوح آپ کی یادگار میں نصب کی گئی اور جلسۂ عام میں ایک سپاسنامہ اعترافِ امتنان کے طور پر ممبرانِ لائبریری کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جس میں آپ کی لیاقتِ علمی، شرافت، بے تعصبی اور ہردلعزیزی کا ذکر

کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں آپ کی پبلک خدمات کا اظہار کیا گیا:-

"آپ نے جو خدمات، بحیثیت آنریری منصف و مجسٹریٹ انجام دیں، وہ جمہور کے نزدیک بہت قدر کے لائق سمجھی گئیں- جس آزادی اور معدلت گستری سے آپ نے یہ خدمتیں انجام دیں، اس کی نظیر اس شہر میں کمتر ملتی ہے اور پھر جس استغناء سے آپ نے دونوں عہدوں سے دست کشی کی، وہ اس شہر کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ ان عہدوں کو حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں، لیکن آپ نے ان عہدوں کو ایسی بے پرواہی سے چھوڑا، گویا آپ ان کی طرف سے بالکل مستغنی و بے نیاز تھے- صحیح یہ ہے کہ آپ نے ان عہدوں کو خود تلاش نہیں کیا، بلکہ ان عہدوں نے خود آپ کو ڈھونڈھا تھا- یعنی حکام نے آپ کی لیاقتوں اور کارگزاریوں کے صلے میں آپ کو یہ عہدے عطا فرمائے تھے کہ عامۂ رعایا کے حق میں، آپ باعثِ رحمت اور موجب برکت ثابت ہوں- جب اس شہر میں ۱۹۲۱ء میں پنچایت کمیٹیاں قائم ہوئیں، تو ایک عظیم الشان جلسے میں ہندوؤں مسلمانوں نے آپ کو سرپنچ انتخاب کیا اور اس صیغے میں بھی آپ کی خدمتیں قابل تحسین سمجھی گئیں- آپ نے جس آزادی اور رحمدلی سے سنٹرل جیل کی انسپکٹری کی وہ اہل زنداں کو ہمیشہ یاد رہے گی- ہمارے شہر کے اکثر بڑے آدمی اس عہدے پر مقرر ہوئے مگر کسی نے بیچارے قیدیوں کے حالِ زار پر کوئی توجہ مبذول نہ کی- آپ نے ہمیشہ رپورٹیں لکھیں، جن میں آپ نے اہل زنداں کی غذا، آرام و آسائش، سیر و تفریح کے واسطے وقتاً فوقتاً سفارشیں کیں- پولیٹیکل قیدیوں کو خاندان کے عزیزوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت دلوائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل زنداں عموماً اور پولیٹیکل قیدی خصوصاً، آپ کو اپنے حق میں بخشندۂ برکات سمجھتے رہے- پانچ برس سے آپ نے جو شاندار خدمتیں بطور میر مجلس ہندو مسلم اتحاد بورڈ، کے انجام دیں، وہ حکام عالی مقام سے پوشیدہ نہیں ہیں اور شہر فتحگڑھ، بلکہ تمام ضلع کے ہندو مسلمان ان سے بخوبی واقف ہیں- آپ کی صدارت میں پانچ سال سے اس شہر میں نہایت امن واماں رہی ہے اور سب ہندو مسلم تیوہار،

بہ تزک و احتشام اور بحسن و خوبی تمام، انجام پا رہے ہیں، جس کی وجہ سب سے بڑی یہ ہے کہ ہمارے اتحاد بورڈ کے میر مجلس، یعنی آپ، ایسے شخص ہیں جو تعصبات مذہبی سے محض نا آشنا اور فسادات قومی کے دشمن ہیں۔ بورڈ کا کام اور انتظام اس حسن اخلاق اور حسنِ تدبیر سے ہوتا رہا ہے کہ پانچ برس میں کبھی ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ گویا سب کام بہ اتفاق تمام انجام پاتے رہے۔ آپ کی سفارش پر آٹھ یا نو ہندو مسلم ارکان بورڈ کی خدمتوں کی قدر دانی منجانب حکام ضلع، دو مرتبہ کی گئی اور خوشنودی مزاج کی سندیں عطا ہوئیں"

شہیدِ ادب نے جنگ عظیم کے دوران میں بحیثیت سکریٹری لائبریری، چار برس تک، بطور "وار لکچرر" کے گورنمنٹ اور رعایا کی خدمت بخوبی تمام اور بجوش اسلوبی مالا کلام انجام دی اور ان عظیم الشان جلسوں میں، جو مجسٹریٹ ضلع کی صدارت میں منعقد ہوئے، آپ نے وہ فصیح و بلیغ پولیٹیکل تقریریں فرمائیں جو آپ کا علمی کارنامہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ پولیٹیکل لکچر (جو بعنوان "جنگ عظیم" شائع ہو چکے ہیں) گورنمنٹ اور رعایا کے حق میں رحمت و برکت ثابت ہوئے اور رعایا اور سرکار کے باہم خیر خواہی اور ہمدردی کے تعلقات میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جدید حالات میں بھی وہ ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں، کیونکہ ان کے مطالعے کے بعد ہر شخص اسی نتیجے پر پہونچتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں بھی اتحادی طاقتیں آخر کار اپنے زبردست اخلاقی وسائل کی بنا پر کامیاب ہوں گی۔

آپ کے خطبات کا مجموعہ موسومہ "خطبات شران" ایک رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں آپ نے اخلاقی، علمی، سیاسی اور تمدنی ہر قسم کے مباحث پر سلیس اور دلچسپ الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی تقریریں بہت صاف اور سلجھی ہوئی اور طرزِ ادا نہایت دلکش ہے۔ زبان وہی ہے جو فصحائے دہلی و لکھنؤ بولتے ہیں، جس کے بارے میں آپ نے خود ایک خطبے کے دوران میں ارشاد فرمایا ہے "اُردو میں نے پیر زالان کشمیر (اپنی ماں۔ بہن وغیرہ) سے سیکھی ہے" حق یہ ہے

کہ ایسی فصاحت اور بلاغت جیسی کہ آپ کے خطبات میں ہے، اُسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس نے اپنی ماں، بہن کی گود میں زبان سیکھی ہو -

"خطبات مشران" کے مختلف منتخب خطبے، آگرہ یونیورسٹی کے ایم، اے ۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے بی، اے آنرز اور جامعہ اُردو آگرہ کے امتحانات ادیبِ ماہر، و ادیب کامل، کے نصابات میں شامل کیے گئے ہیں - اور یہ کتاب صوبۂ متحدہ اور ریاست ہائے حیدرآباد و کشمیر کی تمام درسگاہوں کے کتب خانوں کے لیے منظور ہو چکی ہے -

علم و ادب سے آپ کو جو روحانی تعلق تھا اُس کے اظہار میں یہ واقعہ خصوصیت سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو ستتر برس کی عمر میں فرخ آباد کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں بحیثیت صدر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے آپ جاں بحق ہوئے اور قوم سے "شہیدِ ادب" کا خطاب پایا ؎

ایسی مرگِ کامراں ملتی ہے کس انسان کو
زندۂ جاوید کہنا چاہیئے مُشران کو



"شہید ادب"
آنجہانی پنڈت سندر نراین مشران
رئیس فرخ آباد

درخت ہوں کہ دھوپ اور ہوا کو روکیں بس نوجوان پودے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی مہمانی اور خوراک کا کر لیتا
ہے۔ پانی زمین سے جذب کرتا ہے اوسکی جڑیں زمین کی مٹی کو پکڑ لیتی ہیں۔ ہوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے
اسکے سوا اوسکی ہمت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہیے جسنے سالہا سال کی دھوپ اور سالہا سال کا مینہ اور جاڑے گرمی سردی اور برف
اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اوسمیں ثمر
لگتا ہے تب وہ ہمارے پیٹ اور پاس کھانا ہم لوگ اوسکے پھل پھول چھال لکڑی پتے لیتے ہیں وہ سب اور اوس میں دونوں کی
خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہنچاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی

عکسِ تحریر شہید ادب

مقدمہ

از

شاعرِ حریت حضرت نسیم امروہوی

مقدمہ

از شاعرِ حریت حضرت نسیم امروہوی

پنڈت سُندر نراین مُشران مرحوم کے خطبات پر مقدمے کی حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر مشکل ہے، اس کا اندازہ صرف وہی شخص کرسکتا ہے، جس کی طبع رسا، ان بلند پایہ خطبات کی علمی اور ادبی گہرائیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ خطبات، جو معاشرت، ادب، تاریخ، سیاست اور علم و حکمت کے مختلف اور بیشتر شعبوں پر حاوی ہیں، اپنے تعارف و تبصرہ کے لیے ایک فکر نکتہ رس اور طبع نقاد کے محتاج ہیں۔ مشہور ہے کہ جب گبن نے اپنی مشہور تاریخ "عروج و زوال روما" لکھ کر ختم کی تو اس نے جوشِ مسرت میں مفتخرانہ انداز سے کہا تھا:۔ "میں اپنی کتاب کے لیے مقدمہ نویس کہاں سے لاؤں"۔ ــــ گبن نے ان چند لفظوں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری تصنیف جس پایے کی ہے، اس کے شایانِ شان مقدمہ لکھنے والا، صفحۂ ارض پر کوئی موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ گبن کو اپنی تاریخ کے لیے کوئی ایسا مقدمہ نویس بل جاتا جو اس کے محققانہ معیارِ انتخاب پر پورا اُترتا، لیکن جہاں تک خطباتِ مُشران کی بلند پائگی اور ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے، یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ قلم جو کہ ان خطبات کی حقیقی اہمیت کو واضح کرسکے، کم سے کم اس شخص کے پاس نہیں ہے، جو اس وقت اس سلسلے میں خامہ فرسائی کی ناکام کوشش کررہا ہے۔ یہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ "خطباتِ مُشران" پر کچھ لکھنا آسان نہیں۔ ان خطبوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک نظرِ غائر اور فکرِ جامع کا محتاج ہے۔ اوّل تو ادبیات میں "خطبہ" یوں ہی ایک مشکل ترین اور جامع ترین صنف ہے اور پھر اس صنفِ ادب کی خصوصیات کو علمی اصول پر بیان کرنا اور ان کی تمام وسعتوں کو چند سطروں میں

سمیٹ کر کسی خطیب کے خطبوں کی ادبی اور علمی خوبیوں پر روشنی ڈالنا اس قدر دشوار اور جامعیت طلب ہے جس کی حد و انتہا نہیں۔

پنڈت جی کے خطبات علم و ادب، تاریخ و سیاست، تمدن و معاشرت اور نفسیات کے بے شمار اور اہم ترین مسائل پر مشتمل ہیں، جن سے اس مجموعے میں ایک مستقل علمی تصنیف کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ موصوف نے جس موضوع کو بھی لیا ہے، اس کی جزئی تفصیلات تک بیان کر دی ہیں۔ درحقیقت ان کا ہر خطبہ بجائے خود ایک معنی خیز مقالہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مقالہ نگار اپنے خیالات کو پہلے قلمبند کر لیتا ہے پھر منظر عام پر لاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک خطیب اپنے دلائل کو زبانی بیان کرتا ہے اور ادائے مافی الضمیر میں زبان قلم کی ترجمانی کا محتاج نہیں ہوتا۔ مقالہ نگار اظہار خیالات کے وقت آزاد ہوتا ہے۔ وہ ایک فقرہ لکھ کر ہزار بار مٹا سکتا ہے اور دس ہزار بار بنا سکتا ہے لیکن ایک خطیب کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔ وہ عوام کے مجمع میں گھرا ہوتا ہے۔ اس کے پاس اظہار و بیان کے لیے محدود وقت اور محدود گنجائش ہوتی ہے۔ اُسے اپنے دل، دماغ اور زبان تینوں اعضا سے بیک وقت کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے پاس سوچنے کو وقت نہیں ہوتا اور نہ اثنائے تقریر میں اپنی یادداشت کو تازہ کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں خطبے کی علمی شان قائم و برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہے۔

زیر نظر خطبات وہ تقاریر ہیں جو پنڈت جی نے مختلف سیاسی، ادبی اور معاشرتی مجلسوں میں ارشاد فرمائیں اور اسی وقت ان کے کاتب خاص نے قلمبند کر لیں۔ وہ تقریر کرتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ ایسا اتفاق بہت کم ہوا ہے کہ موصوف نے ان پر نظر ثانی کی زحمت گوارا فرمائی ہو۔ کل مجموعے میں صرف تین خطبے ایسے ہیں جو پہلے سے لکھے گئے تھے اور پنڈت جی نے جلسوں میں انھیں پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ تینوں خطبات گزشتہ جنگ عظیم کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ وہ سر تا سر تاریخی موضوعات تھے، متعدد ممالک کی جغرافیائی، بری اور بحری

کا انکشاف اسرار کے اندرونی نظم ونسق ملکی اور ناگزیر تھا ان کے لیے کرنا بحث سے پوزیشن
بھی ضروری تھا ، اس لیے محض تقریر کے دامن میں ان کا سمانا امکان کے حدود سے باہر
تھا ۔ ان خطبات کے علاوہ بقیہ تمام خطبے وہ ہیں جو اظہار و بیان سے قبل قیدِ تحریر میں
نہیں آئے ۔ اور اُس وقت لکھے گئے جبکہ وہ کسی جلسے میں ادا ہو رہے تھے ۔

خارج از موضوع نہ ہوگا اگر اس موقع پر صنف خطبہ و تقریر کے متعلق منطقیانہ زاویۂ نگاہ
سے کچھ بیان کر دیا جائے ، جس کے بعد ان خطبات کی اہمیت واضح ہونے کے مزید
امکانات پیدا ہو جائیں گے ۔ خطبہ کیا ہے ۔ ؟ وہ تقریر جو کسی جلسے میں کی جائے ۔
اس بیان کے مطابق فن تقریر و خطابت میں بظاہر کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا مگر
نظر غائر سے دیکھا جائے تو ان دونوں میں بڑا فرق ہے ۔ تقریر اس بیان کو کہتے ہیں
جو کسی جلسے یا صحبت میں کسی بھی موضوع یا مسئلے پر ارادۃً دیا گیا ہو مگر خطبہ صرف وہی
بیان ہے جو علمی مسائل کی تحقیق و تشریح کے لیے یا کسی موضوع کو عالمانہ لہجے اور
انداز بیان میں سامعین کے ذہن نشین کرنے کے لیے کسی منبر یا پلیٹ فارم سے
دیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ تقریر میں یہ حد بندی نہیں ہوتی ۔ گویا خطبہ و تقریر میں عموم و
خصوص مطلق کی نسبت ہے ۔ اسی بات کو زیادہ واضح لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے
ہیں کہ صرف علمی تقاریر کو ہی خطبات کہا جا سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں
مُقرّر ہزاروں لاکھوں ہوتے ہیں مگر ان بے شمار مُقرّروں میں خطیب اُنگلیوں پر گنے
جا سکتے ہیں ۔ مُقرّر اور خطیب میں وہی فرق ہے جو ایک مُصنّف اور محقق میں ہوتا
ہے ۔ اگرچہ محقق بھی اپنی تحقیقات کی تصنیف و تالیف کے اعتبار سے مُصنّف کہلاتا
ہے مگر اس کا درجہ محض مصنّف سے بالاتر ہوتا ہے ۔ اسی طرح ایک خطیب بھی ایک
مُقرّر سے اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے ۔

خطبے کی تعریف کے بعد سرسری طور سے یہ لکھ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
اس کی اصل و ابتدا کہاں سے ہوئی ۔ درحقیقت خطبہ اُس عہد کی پیداوار ہے جب
دنیا میں کتابوں کا رواج عام نہ تھا ۔ اس لیے اُس عہد کے علماء و فضلاء اپنی تحقیقات کو

مستقل تصنیف و تحریر کی شکل میں پیش کرنے کے بجائے، اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ گویا آج جس طرح درسگاہوں میں علمی مسائل پر لکچر دیے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح عہد قدیم میں خطبات کا رواج تھا۔ فرق یہ ہے کہ آج لکچر ایک اضافی چیز ہے، مگر اُس زمانے میں ایک خطبہ ہی سب کچھ ہوتا تھا اور تعلیم و تدریس کا واحد ذریعہ وہی تھا۔ اساتذہ اپنے شاگردوں سے مختلف موضوعات پر خطبے دلواتے تھے۔ یہ گویا ان کی علمی استعداد اور قابلیت کا امتحان ہوتا تھا۔ جوں جوں تحریر و کتابت کا رواج بڑھتا گیا، خطبات کی اہمیت و مقبولیت میں کمی آتی گئی۔ یونان علم و حکمت کا گھر تھا اور اسی لیے وہ اپنے خطباء کی جادو بیانی اور علمی عظمت کے لیے مشہور ہے۔ یونان کے بعد علمی دنیا میں روما کا نمبر آتا ہے۔ رومی خطیب بھی تاریخ میں غیر فانی ہستی رکھتے ہیں۔ مشرق میں عربی خطباء اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے ضرب المثل ہیں، مگر عربی خطیبوں کی تقاریر میں (حضرت علیؑ کی نہج البلاغہ کے علاوہ) علمی مسائل کی اتنی فراوانی نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی خطباء صرف اپنی زباندانی اور قدرتِ کلام کا اظہار کرنے کے لیے منبر خطابت کو زیب دیتے تھے۔ عہدِ جدید میں خطابت کا رواج عام طور پر بہت کم ہے۔ ہماری مُراد ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان میں مُقرر بہت سے ہیں مگر خطباء کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اگر کچھ خطیب ہیں بھی تو ان کے خطبے بہت کم قیدِ تحریر میں آئے ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ علوم و مصنفات میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم اور سر سید اعظم کے خطبات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان میں اور خطباتِ مُشران میں بیّن فرق ہے۔ وہ خطبے یا تو ایسے ہیں جو اوّل مضموں نگاری کے اصول پر قلمبند کر لیے گئے، اس کے بعد مجلس میں پیش ہوئے یا اُن میں صرف تقریر کی شان ہے، خطبے کا انداز بیان نہیں، نیز ان میں خطباتِ مُشران کی برابر تنوع موضوع بھی نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ہم ہر دو مذکور الصدر حضرات کی خطابت کی جامعیت کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔ ان دونوں بزرگوں کے علاوہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، کوئی مستقل اور

اس اعتبار سے پنڈت جی مہتم بالشان خطابیاتی مجموعہ اُردو میں مرتب نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے پنڈت جی کے خطبات کا مجموعہ اور بھی قابل قدر ہو جاتا ہے، کیونکہ اس مجموعے نے ہماری زبان میں ایک ایسی تالیف کا اضافہ کیا ہے جس کی ہمپایہ مؤلفات کی اُردو ادب میں بہت کمی تھی اور اس کمی کے باعث ہمارا لٹریچر، روم و یونان و عرب کے ادبیات کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

اس زمانے میں جبکہ بعض تنگ نظر حلقوں کی طرف سے زبان میں بھی فرقہ پرستی کے زہر کو داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، مبارک ہیں وہ شخصیتیں اور وہ نفوس جو اپنی زبان اور اپنے ادب کی ترقی کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی بہترین کوشش صرف کر رہے ہیں۔ پنڈت جی کے خطبات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سینہ علم و حکمت کے پہلو بہ پہلو ایسے ہی صدق و صفا کا مخزن تھا۔ عالم انسانیت کے بہترین حکیموں اور بلند نظر فلسفیوں کی طرح ان کی نگاہ، رنگ، نسل، خون، جغرافیہ، سماج اور قوم و ملت کی تمام حد بندیوں سے بالاتر تھی۔ وہ عربی و فارسی و انگریزی کے بہترین عالم تھے۔ ان کو ادبی خدمات سے عشق تھا۔ انھوں نے ادب کے ہر شعبے میں کامل عبور اور حقیقی دستگاہ بہم پہنچائی تھی اور دماغ فلسفیانہ، زبان عارفانہ، فکر حکیمانہ اور دلِ شاعرانہ پایا تھا ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

ان کا مجموعۂ خطبات اکاون ۵۱ خطبوں اور تقریروں پر مشتمل ہے۔ اگر موضوع کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی جائے، تو اس مجموعے میں ادبی، سیاسی، مذہبی، تاریخی، طبّی، معاشرتی اور عام نوعیت کے خطبات ہیں۔ دو خطبے فن موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض خطبات کسی خاص تحریک یا تقریب کے سلسلے میں ہیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل وغیرہ۔ بعض رخصتی تقاریر ہیں بعض خطبے نیم سیاسی اور نیم تاریخی ہیں۔ جنگِ عظیم کے موضوع پر جس قدر خطبے ہیں وہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ بعض خطبے ایسے ہیں جن میں رہنمایان قوم و ملت یا بانیان مذاہب کے

اوصاف حسنہ پر سبق آموز تبصرہ کر کے ایک خطیب کے فرائض انجام دیے ہیں، جو کہ شاعر کے بعد سب سے پہلے اصلاح ملک و قوم کا فطری حق رکھتا ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً پنڈت منشرام اُن گرانمایہ قوم پرستوں میں سے تھے جو ہندوستان کی واحد قومیت، ہندوستان کے مشترکہ ادب اور ہندوستان کے تمدنی خصوصیات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ پنڈت جی کی شخصیت ہندو مسلم ملاپ کا ادبی اور انسانی سنگم تھی۔ اُن کے خطبات، اُن کی فراخدلی، صلح کل حکمت عملی اور انسانی عظمت و کمال کا گہرا اثر قلب پر ڈالتے ہیں۔ وہ ہماری اس ادبی تحریک کے علمبردار ہیں جو ہندو مسلم و دیگر اقوامِ ہند کی سوسائٹی کی مشترکہ ترقی اور ہم آہنگی کا نمائندہ ہے —— وہ ادبی تحریک جس کا پودا ہند و عجم کی معتدل آب و ہوا میں نصب ہوا، مغل حکومت اور ہندی ریاستوں نے اس کی آبیاری کی، عوام نے بار آور کیا اور پنڈت جی کے ایسے نیک نفس اور عالی ظرف ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

ہر زبان اور ہر ادب کی تخلیق کسی نہ کسی تمدنی، معاشرتی یا اور کسی نوع کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین عمرانی اور انقلابی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے ماتحت ہوا کرتی ہے اور اُس زبان کے ادبیات میں صرف وہی تصنیف ایک باوقار جگہ پانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے، جو اس مقصد سے بعید نہ ہو جائے۔ بنابریں یہ بیان کرنے سے پہلے کہ پنڈت جی کے خطبات میں کس حد تک یہ ادبی روح پائی جاتی ہے اور ان سے کس قدر وہ مقصد پورا ہوتا ہے جو اُردو کی تخلیق میں مضمر تھا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اُردو کی ابتدا اور نشو و نما کے تاریخی مرقع پر ایک نظر ڈالی جائے اور اُردو ادب کے سماجی اور ذہنی پس منظر کو اور اُجاگر کر دیا جائے۔ یہ نہ صرف ایک دلچسپ علمی مشغلہ ہوگا بلکہ اس طرح ہم یہ بھی محسوس کریں گے کہ علم و ادب اور تمدن و تہذیب کی وہ کون سی فضا تھی جو پنڈت منشرام جیسے قوم پرست ادیبوں کو پیدا کرتی تھی۔ اس اہم مسئلے کا مختصر سا تذکرہ کرنے کے بعد ہم پنڈت جی کے زیرِ نظر خطبات کی ادبی اہمیت اور علمی پایگی کے متعلق اظہارِ خیال کریں گے اور بتائیں گے کہ اُردو کے بازار میں، وہ کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

فرانس کے غیر فانی ادیب ژان ژاک روسو کا مقولہ ہے کہ:-

" اگر تم کسی سوسائٹی کی دماغی اور تمدنی کیفیات کا صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہو تو اُس کے ادبی کارناموں کا مطالعہ کرو۔ یہ دیکھو کہ جس ادب کی وہ نمایندگی کرتی ہے وہ انقلاب و تغیر کے کتنے دوروں اور عہد زمانہ کی کتنی گردشوں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ جب تم اُس کے ادب کے مختلف ادوار سے واقف ہو جاؤ گے تو تمھیں اس سوسائٹی کی تاریخی رفتار اور تدریجی تبدیلیوں کا پتہ لگانے میں آسانی ہوگی "

ان لفظوں میں روسو نے ادب کو قوموں کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کی ذہنی کیفیت اور تدریجی ترقی کا معیار و مظہر قرار دیا ہے اور پھر ادب کی زبردست طاقتوں اور اس کے روحانی اور اخلاقی نتائج پر بحث کرتے ہوئے، ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے:-

" ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ادب کے مندر میں انسانیت کی دیوی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اپنے پجاریوں کو ذہن و دماغ اور علم و حکمت کی ایسی بلند ترین چوٹی پر لے جانا چاہتی ہے جہاں، رنگ، نسل، خون اور وطن کے امتیازات مٹ جائیں اور انسان، کاہنوں، مذہبی لیڈروں اور کلیسا کے علمبرداروں کی گرفت سے آزاد ہو کر حقیقی انسان بن سکے "

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مصنّف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ:-

" اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو نہ مذہب کے نام پر کبھی لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لیے خانہ جنگیاں "

حقیقت بھی یہی ہے کہ ادب عالمگیر انسانی تصور کی نمایندگی کرتا ہے۔ وہ بین الاقوامیت کا ترجمان اور آزاد ضمیر و خیال کا نقیب ہے۔ حقیقی ادب وہی ہے جو اس معیار پر

پورا اُترے اور حقیقی ادیب وہی ہے جو اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے ــــ ــــ آئیے متذکرہ حقیقتوں اور سچائیوں کی روشنی میں ہم اپنے ادب کا جائزہ لیں۔ روسو نے لکھا ہے کہ ادب سوسائٹی کی ترقیوں اور سماجی تبدیلیوں کا آلۂ حرکت پیما ہے۔ ادب کی انسانی قدر و قیمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ حقیقی ادب، حقیقی انسانیت کا ترجمان ہے اور اسی کے ذریعہ، انسانیت کے مختلف اجزا کو ایک رشتۂ اتحاد و اخوت میں پرویا جا سکتا ہے۔ یعنی بین الاقوامی اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ادب اور صرف ادب ہے۔

ادبیاتِ اُردو کی تاریخ ظہور و آغاز، اس کی عہد بعہد تبدیلیوں اور ارتقائی مدارج پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو آسانی کے ساتھ ہم اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ سماجی ترقیوں اور متحدہ تہذیب و تمدن کی تشکیل و ترتیب کے مختلف مدارج میں کارفرما پا سکتے ہیں۔ اُردو ہندو مسلم کی شہرۂ آفاق تہذیبوں کا ایک ذہنی و دماغی سنگم ہے۔ اُردو کے حرف حرف اور نقطے نقطے پر ہندو مسلم اتحاد کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ درحقیقت اُردو کا ظہور ہی اس تاریخی ضرورت کے ماتحت ہوا کہ مسلم نو واردوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان کوئی مشترک رابطہ پیدا کیا جائے۔ قدرت نے ان تمدّنی و معاشرتی ضروریات کی تکمیل کے لیے اُردو کا سانچہ بنایا اور اگر ہم یہ کہیں تو بجا ہے کہ آج وہ مشترکہ قومیت جس پر ہم اس قدر نازاں ہیں، ادب اور زبان کے اسی قدرتی سانچے سے ڈھل کر نکلی ہے۔

جب مسلمان نَو وارِد کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تو ہر قدم پر مہمان اور میزبان کو اختلافِ زبان کی دقّتیں محسوس ہونے لگیں۔ ہندوستان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر قوم کو اپنا لیتا ہے اور پھر وہ قوم ہندوستان کی دوسری قوموں سے اس قدر گھُل مِل جاتی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی اور اپنے اور پرائے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ مسلمان ابتداءً ہندوستان کے لیے اجنبی تھے۔ وہ شروع شروع میں اس عظیم الشان برِّاعظم کے اندر تنہا سے نظر آتے تھے، لیکن

آہستہ آہستہ ہندوستان کا پوشیدہ جادو اُن پر اثر کر رہا تھا - وہ ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی سماج میں غیر ارادی طور پر جذب ہوتے جا رہے تھے - جوں جوں ہندو اور مسلمان کے درمیان ارتباط بڑھتا جاتا تھا ، ایک ایسی قدرتی بولی خود بخود عالمِ وجود میں آتی جاتی تھی ، جو ہندو اور مسلمان دونوں کی محبوب اور دلپسند تھی - یہ بولی تمام بندشوں سے آزاد تھی - یہ زبان تمام حدبندیوں سے بلند تھی - اسے ادیبوں اور شاعروں کی کسی جماعت نے پیدا نہیں کیا تھا - اسے عوام نے پیدا کیا تھا - یہ عوام کی گود میں پلی تھی - اسے سوسائٹی کے نچلے طبقے اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے - حقیقت یہ ہے کہ اُردو کی تخلیق کا سہرا کسی جماعت کے سر نہیں باندھا جا سکتا - وہ خود بخود اس طرح وجود میں آگئی جس طرح تمام فطری طاقتیں مناسب وقت آنے پر ظہور میں آجاتی ہیں - برکھا رُت میں زمین پر جو ننھے ننھے پودے لہلہانے لگتے ہیں ، ان کی تخم ریزی کوئی نہیں کیا کرتا - موسمِ بہار میں جگہ جگہ جو پھول کھل جاتے ہیں ، اُن کی آبیاری کسی کے ذمّہ نہیں ہوتی - قدرت ان معصوم پودوں کی خود دایہ گیری کرتی ہے اور انھیں پروان چڑھاتی ہے - ہماری زبان بھی اسی قدرتی عمل کا نتیجہ ہے - تاریخ کا ہاتھ تیزی کے ساتھ ہندو مسلم تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے رہا تھا اور اُردو اس نئی تہذیب کے بطن میں پرورش پا رہی تھی - مختلف قومیں ایک مرکز پر جمع ہو رہی تھیں - مختلف بولیاں ایک محفل میں بولی جا رہی تھیں - چمن میں بھانت بھانت کے پرندے تھے اور ہر ایک مختلف راگ الاپ رہا تھا - لیکن اس رنگا رنگی اور بیگانگی کے پردے میں ایک نیا یگانگت کا راگ پیدا ہو رہا تھا اور وہ نغمۂ نَو اُردو کا نغمہ تھا -

اُردو کی اصل برج بھاشا اور فارسی کو بتایا جاتا ہے - برج کے علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ شیریں ہندی زبان تھی - جب مسلمان سندھ کو عبور کر کے شمالی ہند میں پہونچے اور دہلی نئی حکومت کا پایۂ تخت قرار پایا تو ہندو مسلم اختلاط اور بڑھ گیا - سب سے پہلے مسلمان نو وارد کی حیثیت سے سندھ کے سواحل پر لنگر انداز ہوئے تھے

اور آہستہ آہستہ مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئی تھیں - ان ریاستوں کی سرکاری زبان عربی تھی اور ان کے درباروں پر بھی عربی تہذیب و تمدن کا اثر غالب تھا -

عربوں کی یہ ایک تاریخی خصوصیت رہی ہے کہ وہ جس سرزمین پر پہونچتے تھے اُسے اپنا لیتے تھے - وہ مقبوضہ علاقوں کے دل و دماغ کو بالکل اپنے سانچے میں ڈھال لیتے تھے - ایران اس کی ایک بہترین مثال ہمارے واسطے مہیا کرتا ہے - ایرانیوں کو اپنی تہذیب و تمدن پر ناز رہا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ایشیائی قوموں میں ایرانی اپنی نفاستِ ذوق، پاکیزگیِ فکر اور ذہنی و دماغی اوصاف کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں - فردوسی کہتا ہے کہ ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار　　عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

لیکن جب عربوں نے ایران کو فتح کیا تو انہی اونٹ کا دودھ پینے والے بدویوں نے جمشید و کیخسرو کی سرزمین کے ذرّے ذرّے کو عربی رنگ میں رنگ دیا - عربی اثر سے ایرانیوں نے نہ صرف اپنا مذہب بدل دیا بلکہ اپنی قومی خصوصیات، اپنے ملکی رسوم، اپنی زبان، اپنی ہزار سالہ تہذیب، غرض اپنا سب کچھ اپنے فاتحوں کے حوالے کر دیا - عربوں نے ایران کے جنت نظیر سبزہ زاروں پر ہی قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ ایرانی دل و دماغ کو بھی مسخّر کر لیا تھا - بلا شبہ عرب بھی ایرانیوں سے متاثر ہوئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی عربی روح تک کو بھول گئے - چنانچہ مورّخین کا اتفاق ہے کہ خلافت عباسیہ، عجمی تہذیب اور ایرانی اثر و نفوذ کا مکمل نمونہ تھی - یہ ایک ضمنی بحث تھی جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ عرب فاتحین کے ہاتھوں میں مسخر کرنے والے ہتھیار ہی نہ تھے بلکہ ان کے دماغوں میں دل فتح کرنے والی طاقت اور ان کی باتوں میں من موہنے والا جادو بھی تھا - ہندوستان میں کبھی خالص عربی حکومت قائم نہیں ہوئی - البتہ سندھ کے چند علاقوں میں کچھ دن کے لیے چند اسلامی ریاستیں برسرِ اقتدار آئیں -

اگرچہ ان کا سیاسی وقار بہت محدود تھا، لیکن اس کے باوجود سندھی زبان و تہذیب پر عربی ادب اور سماج کے جو نقوش ثبت ہوئے وہ محتاج اظہار نہیں۔ سندھی زبان میں آج تک عربی الفاظ و محاورات کی کثرت ہے اور وہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عربی کے یہ اثرات سندھ تک محدود رہے۔ شمالی اور وسطی ہند میں جو اسلامی نو وارد داخل ہوئے وہ عرب نہ تھے، ایرانی، افغانی اور ترک تھے۔ لہٰذا ہندوستان میں اس کے بعد جو تہذیبی اور ادبی تحریکیں بار آور ہوئیں، ان میں عربی اثرات سے زیادہ ایرانی و ترکی اور افغانی رنگ جھلک رہا تھا۔ چنانچہ اردو جو ہندو مسلم ملاپ کا خوشگوار پھل ہے وہ عربی رنگ و بو کا سرمایہ دار نہیں بلکہ اس میں ایرانی حلاوت، افغانی پختگی، ترکی ذائقہ اور ہندوستانی رس، یہ چاروں عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ سطور میں فرانسیسی ادیب "ژان ژاک روسو" کا ایک مقولہ نقل کیا تھا کہ:۔

"ہر قوم کا ادب اس کی تاریخی سماجی تبدیلیوں کا آئینہ ہوا کرتا ہے"

—— آیئے اُردو کے آئینے میں ہم ہندوستانی قومیت کی مختلف تاریخی اور سماجی تبدیلیوں اور تدریجی انقلابات کے خال و خط کا معائنہ کریں —— اگر ہم کسی ادبی تحریک کا تاریخی جائزہ لینا چاہتے ہیں تو خارجی شہادتوں سے قطع نظر تین پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی جائے گی تاکہ اس ادب کی حقیقی روح کو بے نقاب کیا جا سکے اور یہ بتلایا جا سکے کہ وہ تاریخی انقلابات کے کتنے دَوروں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس ادب کی تعمیر کن کن زبانوں سے ہوئی ہے یعنی کن کن مختلف زبان بولنے والی قوموں نے ادب کو پیدا کیا ہے۔ بطور مثال آپ فارسی ادب پر ایک نظر ڈالیے۔ خود فارسی زبان کے الفاظ، محاورات، لسانی تراکیب، مصطلحات اور مصادر و افعال آپ کو بتلادیں گے کہ فارسی ادب و زبان کو عربوں اور ایرانیوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ ایک داخلی شہادت ہے اس ادب کے تاریخی ظہور و ارتقاء کی —— آج ہم صرف فارسی زبان کی ساخت سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں

کہ یہ زبان ایک ایسی مشترک سوسائٹی نے پیدا کی تھی جو عربوں اور ایرانیوں پر مشتمل تھی۔ ان دونوں قوموں نے اپنے اپنے الفاظ، اپنے اپنے محاورات اور اپنی اپنی مصطلحات اس نئی زبان کو دیں اور یہ رفتہ رفتہ اپنی موجودہ شکل میں آگئی ـــــ ضمنی طور پر فارسی زبان کی تشکیل سے اُن تعلقات و روابط کا پتہ چلتا ہے جو عربوں اور ایرانیوں کے درمیان تھے۔ ہم اُس زمانے کی پوری تاریخ محض فارسی زبان کے مطالعے سے سمجھ سکتے ہیں ـــــ نئی فارسی زبان میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ ہمیں نظر آتے ہیں ـــ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فارسی کے دامن میں ان لفظوں کی موجودگی ایران کے جدید سیاسی انقلابات کا براہ راست نتیجہ ہے۔ جس طرح قدیم فارسی زبان کے مطالعے سے (جس پر عربی اثر غالب تھا) ہم عرب ایرانی روابط کی وضاحت کر سکتے ہیں اُسی طرح نئی فارسی زبان اُن تاریخی واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے جو ماضی قریب میں ایران کے اندر پیش آتے رہے اور اپنا دیرپا اثر ایرانی ادب اور سماج پر ڈالتے رہے۔

ادب کی لسانی ساخت کے علاوہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ ادب ماضی میں کن کن سماجی، تاریخی اور مذہبی ماحولوں سے گزرا ہے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ادب کے روایاتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ اس ادب میں کس کس قسم کی ادبی، تاریخی اور مذہبی روایات کی نمائندگی پائی جاتی ہے۔ بطور مثال انگریزی لٹریچر یونانی علم الاصنام کی کہانیوں سے بھرپور ہے۔ عربی ادب میں یہودی روایات اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے۔ فارسی کی تمام تر روایات عرب سے ماخوذ ہیں۔ آپ فارسی ادب میں عشق و محبت کا قصصی اور مثالی کردار اگر تلاش کریں گے تو لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا اور یوسف زلیخا کے رومان قدم قدم پر ملیں گے۔ فارسی ادب میں یہ روایات بالکل عام ہیں ـــــ انگریزی لٹریچر میں یونانی علم الاصنام کی جھلک رومی برطانی اختلاط اور اُن تاریخی واقعات کی صریحی شہادت ہے جو رومن امپائر کے عروج و کمال سے وابستہ ہیں، جب جزیرۂ برطانیہ

رومی شاہنشاہیت کا ایک جزو تھا اور انگریزی دل و دماغ رومی اور یونانی اثرات سے معمور تھے۔ عربی ادب میں اسرائیلی اور مسیحی روایات کی موجودگی، عرب کی اُس ذہنی، دماغی اور سیاسی حالت کا قدرتی نتیجہ ہے جو قبل از اسلام وہاں پائی جاتی تھی۔ فارسی ادب میں عربی روایات کی کثرت، عربی ایرانی تعلقات اور مذہبی و تمدنی اتحاد کا واضح اور غیر مشتبہ ثبوت ہے۔

کسی ادب کی تاریخی و تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک تیسرا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس ادب کے نفسیاتی رجحانات کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ ہر ادب میں ایک مخصوص روح پائی جاتی ہے، جو اُس قوم کے اجتماعی مزاج سے پیدا ہوتی ہے جس نے اُس ادب کی تشکیل میں حصہ لیا۔ فارسی ادب کے رنگین و لطیف رُجحانات ایرانیوں کے قومی شعور اور اجتماعی مزاج کی پردہ دری کرتے ہیں۔ عربی ادب کے رُجحانات ایک مخصوص کیفیت رکھتے ہیں۔ یہ مخصوص کیفیت درحقیقت عربوں کے نفسیاتی پس منظر کا عکس ہے۔

بہتر ہے کہ ہم اُردو کی تحریک ادبی اور تاریخی نشو و نما کا جائزہ لینے کے لیے انہی تینوں طریقوں کو استعمال کریں۔ ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ شروع ہی سے تسلیم کر لیا گیا ہے) کہ اُردو، ہندو مسلم تہذیبوں اور قومیتوں کے امتزاج و اتحاد کا نتیجہ ہے۔ آئیے اس دعوے کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھیں۔

(الف) اُردو زبان کی ساخت برج بھاشا اور فارسی کے ملاپ سے ہوئی ہے۔ اُردو کی لسانی تشکیل اس کی گواہ ہے۔ اُردو کے تمام افعال و مصادر و روابط و حروف ہندی اور خالص ہندی ہیں۔ اُردو میں پچاس فی صدی اسماء ہندوستانی بولیوں سے لیے گئے ہیں۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُردو دو قوموں کے ارتباط سے ظہور میں آئی ہے۔ ایک وہ قوم جس کی بولی برج بھاشا تھی۔ دوسری وہ قوم جو فارسی زبان استعمال کرتی تھی۔ آپ ہندو مسلم تہذیبوں کے اتصال کا حقیقی پرتو اُردو میں دیکھ لیجیے۔ کیا ضرورت ہے کہ آپ ہندو مسلم تعلقات و روابط

کی تحقیق کے لیے تاریخی دلائل کے انبار لگادیں - کیا فقط اُردو کی بناوٹ یہ نہیں بتاتی کہ ایسی ملی جُلی بولی صرف وہی قومیں بناسکتی ہیں جن کے دل و دماغ ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہوں -

(ب) ادب اُردو کی روایات ہند و مسلم روایات اور علم الاصنام کے اتصال کا بہترین نمونہ ہیں - اُردو ادب شجاعت و جوانمردی کی روایات کا مظہر جہاں رستم و سہراب کو قرار دیتا ہے وہاں ارجن اور بھیم کو بھی نہیں بھولتا - روایات عشق و محبت کی ترجمانی ہم فقط لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل و بلبل اور شمع و پروانہ ہی کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ نل دمن، بھونرا اور کنول، چاند اور چکور اور پپیہے اور کویل بھی عشق و محبت کے ادب اُردو میں بہترین کردار پیش کرتے ہیں - ہمارے ادب میں یوسف کا حسن اور آدم و حوّا کی باہمی محبت ایک مثالیہ کیرکٹر کی حیثیت رکھتی ہے مگر جب عصمت و عفت کا آدرش قائم کرنا پڑے گا تو کون ہے جو سیتا کو بھول جائے - اُردو کا ادیب ظلم و شقاوت کا آئیڈیل نمرود و فرعون کے ساتھ راون کو بھی سمجھنے میں تامل نہیں کرتا - بیستوں کے افسانوں اور کوہ طور کے قصّوں کے ساتھ ہم ہمالیہ اور بندھیاچل کے بھی گیت گاتے ہیں ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں　　چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

دجلے اور فرات کے کنارے گلگشت کرتے کرتے ہم گنگ و جمن کی وادیوں میں بھی جاسکتے ہیں - نوروز اور شب برات کے ساتھ دیوالی اور ہولی کے تذکروں سے بھی ہمارا لٹریچر معمور ہے - موسم بہار کے جشن شگوفہ کی افسانہ طرازی کے دوش بدوش برکھا رُت کی البیلی رنگینیاں بھی ہمارے لٹریچر کے مرقع میں نظر آتی ہیں - ہماری عشقیہ مثنویوں میں راجا اندر کے اکھاڑے کے ساتھ کوہ قاف کے پریزادوں کے حسن و جمال کی بھی تعریف ہے - غرضکہ آپ اُردو لٹریچر کا اوّل سے آخر تک جائزہ لیجیے، آپ کو ہند و مسلم روایات دوش بدوش نظر آئیں گی - یہ تمام چیزیں سماجی ملاپ کی گہرائی، مذہبی خیالات کی یکرنگی، اور ذہنی پس منظر کے اتحاد کی طرف

اشارہ کرتی ہیں۔ اُردو کی ساخت اور ادب اُردو کی مشترک روایات، ہندوستان کی قومیت مشترکہ کی نشانی ہیں۔ تاریخ نے ہمارے دلوں ہمارے دماغوں اور ہمارے ذہنوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ یہ سانچہ ادب اُردو کا سانچہ تھا، مشترک تمدنی روایات کا سانچہ تھا، متحدہ قومیت کا سانچہ تھا۔ اگر آج ادب اُردو کو ہمارے درمیان سے اُٹھا دیا جائے تو متحدہ قومیت، مشترکہ ہندوستانی سماج اور ہندی ایرانی تہذیب (انڈو ایرین کلچر) کی تمام شاندار روایات مہمل ہو کر رہ جائیں گی۔ اُردو اور صرف اُردو اُن ہزار سالہ کوششوں کی شہادت دے سکتی ہے جو ہندوستانی قوموں نے باہمی یکجہتی اور اتحاد کے لیے سماج، تمدن، فلسفے، عقیدے اور تہذیب کے ہر گوشے میں کیں۔ ہم نے اپنی پیاری زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا رشتہ بنا کر ٹوٹے ہوئے دلوں اور بکھرے ہوئے دماغوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اُردو کے دامن میں ہر زبان کے لفظ ہیں، پنجابی، سندھی، فارسی، ترکی، عربی، بنگالی، مرہٹی، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، فرانسیسی۔ غرض مشرق و مغرب میں جتنی جاندار بولیاں اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں سب سے اُردو نے استفادہ کیا ہے۔ آپ ایک سرسری نظر ہی میں ان لفظوں کو تلاش کر سکتے ہیں اور اس سے اُردو کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چِٹّا معمولی سا لفظ ہے جسے ہم روزانہ بولتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اُردو نے اسے پنجابیوں سے لیا ہے۔ باورچی، چلمن، آقا ترکی زبان سے لیے گئے ہیں۔ نیلام پرتگالی ہے۔ گلاس انگریزی ہے۔ یہ لفظ بطور مثال زبان پر آگئے ہیں ورنہ اُردو کے خزانے میں مختلف النوع جواہر ریزوں کی کمی نہیں ہے

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(ج) یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہمارا ادب ہندوستان کی ہزار سالہ سماجی تبدیلیوں اور تمدنی ترقیوں کی کس حد تک نمایندگی کرتا ہے، ہم نے اُردو کی لسانی بناوٹ اور روایاتی پس منظر کو بطور تمثیل پیش کیا۔ اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر

ہمیں ہندو مسلم تہذیبوں کو صحیح طور پر ایک دوسرے کے قریب لانا ہے تو ان نفسیاتی رجحانات سے فائدہ اُٹھانا پڑے گا جو ادب اُردو کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہر سوسائٹی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ہر قوم کا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہوا کرتا ہے اور اس کے ادب میں بھی وہی مخصوص قومی روح پائی جاتی ہے جو اس قوم یا اس سوسائٹی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ انگریزی لٹریچر میں جو نفسی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی انگریزی ادب و شعر کے مطالعے سے آپ پر جو اثر پڑتا ہے، وہ حقیقت میں برطانی قوم کی مخصوص اجتماعی روح کا تاثر ہے۔ عربِ جاہلیت کے قصائد سے ہم آج بھی ایامِ جاہلیت کی قومی روح کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم امرؤ القیس، زُہیر اور ایامِ جاہلیت کے دوسرے شعرائے عرب کے قصیدوں میں عربی نفسیات، عربی شعور اور عرب کی اجتماعی زندگی کے نقوش کی جھلکیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایرانی لٹریچر ایرانیوں کی نفسی زندگی اور ان کے قومی تاثر و احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُردو ادب کا بھی ایک خاص نفسیاتی مزاج ہے، ایک مخصوص اثر ہے جو اُردو نظم و نثر کا مطالعہ ہم پر ڈالتا ہے۔ اُردو لٹریچر کے رجحانات اور امکانات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں مختلف ادبی رجحانوں، مختلف سماجی نظریوں اور مختلف دماغی تحریکوں کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اُردو ایک ایسا جاذب ہے جو ہر نقش کو جذب کر لیتا ہے۔ ماضی بعید میں اس نے ہندی اور فارسی کی قابلیتوں کو چوسا۔ دکن میں پہونچی تو مرہٹی، تامل، تلنگو اور دوسری مقامی بولیوں کا دودھ پیا۔ دہلی دربار میں ترکوں سے سابقہ پڑا تو ترکی سے مانوس ہو گئی۔ جب اٹھارھویں صدی میں دانایانِ فرنگ نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو اُردو نے ان اجنبیوں کی آؤ بھگت کی اور آج اُردو لٹریچر مغربی ادب سے جس قدر متاثر ہو چکا ہے وہ محتاج بیاں نہیں —— اُردو ادب کا مطالعہ ہمیں ایک خاص زاویۂ نظر قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ زاویۂ نظر ہے، ہندوستانی قومیت کے مخصوص رجحانات کا —— اُردو میں ایک طرف ہندو قوم کا حلم،

سادگی اور نرمی ہے تو دوسری طرف مغل ایرانیوں اور ترکوں کی شان و شکوہ۔ اُردو میں کبت بھی ہیں اور نظمیں بھی، دوہے بھی ہیں اور غزلیں بھی، ویدانت بھی ہے تصوف بھی، برہمنیت بھی ہے اسلامیت بھی، راجپوتی آن بان بھی ہے اور عربی شکوہ و شان بھی۔ اُردو ادب کا مزاج ہندوستانیوں کے عام اجتماعی مزاج کی طرح حلیم، بُردبار اور ملنسار ہے۔ انگریزی ادب و تمدن کے اثر سے ہمارے رجحانات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ادب اُردو ان کا بھی آئینہ دار ہے۔ ہمارا قومی مزاج تاریخ کی دس گزشتہ صدیوں میں جن فکری منزلوں اور شعوری مرحلوں سے گزرا ہے، ہمارا ادب ان سب کے اثرات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ادب ہی کسی قوم کی سماجی اور فکری گہرائیوں کے ناپنے کا آلہ ہے۔

ان تمام حقیقتوں کے دُوہرانے کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان میں گزشتہ ہزار سال کے اندر جس قدر سیاسی، سماجی، مذہبی اور فکری انقلابات ہوئے ان کی گود میں اُردو نے جنم لیا۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ ایک شدید انقلاب کی تمہید تھا۔ مسلمان ہندوستان کے دروازے میں داخل ہو کر ایک ایسی دنیائے قدیم کی حدود میں باریاب ہوئے تھے جہاں چار ہزار برس سے ایک مخصوص تہذیب کا دیا جل رہا تھا، علوم و فنون کا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان بھی مصر، بابل، یونان، روم اور چین کی طرح اپنے شاندار ماضی پر فخر کر سکتا ہے۔ ہندوؤں نے دنیائے عتیق ہی میں اپنی ذہانت سے تہذیب کے اُن تمام مدارج کو طے کر لیا تھا جو دنیا کی دوسری قوموں نے سیکڑوں ہزاروں برس بعد طے کیے۔ ہندوستان کسی وقت بھی نیم وحشی اور غیر متمدن نہیں رہا۔ کم سے کم تاریخ کی جہاں تک یادداشت ہے اس نے ہمیشہ ہندوستان کو شعر، ادب، موسیقی، ریاضی، نجوم، ڈراما، قانون اور روحانیت کا گہوارہ پایا ہے۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو اگرچہ اس وقت یہ عظیم مُلک اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے عالمِ زوال و انحطاط میں تھا، مگر چار پانچ ہزار برس میں آریوں نے جس قدر دماغی و علمی ترقیاں کی تھیں،

اُن سب کے نقوش باقی تھے ۔ البیرونی جو غزنویہ عہد میں ہندوستان آیا تھا جی کھول کر ہندوستانی کمالات کی داد دیتا ہے ۔ اس نے ہندوستانی علوم ریاضی کو حیرت اور تعجب کی نظروں سے دیکھا اور اپنے سفرنامے میں ہندوؤں کو دنیا کی سب سے زیادہ عالم و ریاضی داں قوم قرار دیا ۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے علوم اپنے ساتھ لائے ، ان کی تہذیب ، ان کا تمدن ، ان کی زبان اور ان کی قومی خصوصیات ہندوؤں سے جُداگانہ تھیں ، مگر اب یہ اجنبیت و بیگانگی باقی نہ رہ سکتی تھی کیونکہ اِدھر ہندوؤں کو بھی نئے مہمانوں کی مزاجدانی اور نئی دنیا کی ہمزبانی ضروری تھی ۔ مسلمان ہندوستان کو فتح کرنے نہیں اپنا وطن بنانے آئے تھے اور جس ملک کو وہ اپنا وطن قرار دے چکے تھے قدرتی طور پر وہ اس کے دوسرے باشندوں سے بیگانہ اور آزاد نہ رہ سکتے تھے ۔ جب دو برابر کی طاقتیں آپس میں ملتی ہیں تو کچھ دیر تک تو ان میں کشمکش کی سی کیفیت رہتی ہے لیکن اس کے بعد اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے یکجان و دو قالب ہو کر ایک ایسی بہتر و پسندیدہ تر شکل اختیار کر لیتی ہیں جس میں دونوں عنصروں کی بہترین صلاحیتیں موجود ہوں ۔ بسا اوقات دو مختلف پودوں کا پیوند بارآور ہو کر اس قدر لطیف ، بامزہ اور خوشگوار پھل پیدا کرتا ہے کہ وہ خصوصیات پہلی صورت میں ہرگز نہ پیدا ہو سکتی تھیں ۔ ہندو مسلم تہذیبیں بھی اسی قانون قدرت کے ماتحت پہلے پہل متصادم رہیں لیکن اس کے بعد ان میں قربت و یکجائی پیدا ہونے لگی ۔ اس تہذیبی اتصال کے جو نتائج برآمد ہوئے اس کی سب سے زیادہ دلکش مثال اُردو ہے ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اُردو میں شاعرانہ سرگرمیوں کا آغاز کب ہوا ؟ تاریخ صرف اتنا پتہ دیتی ہے کہ وہ سب سے پہلا شاعر جس نے اس نئی بولی کو مُنہ لگایا لاہور کے عہد غزنویہ کا ایک ادیب سعد سلیمان تھا ۔ سعد سلیمان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس نے ہندوستانی میں اپنا کچھ کلام مرتب کیا تھا ، اتفاق کی بات ہے کہ سعد کے تذکرہ نویسوں نے اس کی اس خصوصیت کا ذکر بھی کر دیا ورنہ معلوم نہیں کتنے شوخ طبع لوگوں نے اس نئی بولی میں (جو ابھی تک عوام میں مروج نہ تھی) اپنی موزونیت طبع کے پھول کھلائے ہوں گے جو کہ بغیر مہکے ہوئے گمنامی کی

بادِ سموم سے کمھلا کر رہ گئے۔

بلا شبہ اُردو کی ترویج و ترقی میں اُن صوفیوں اور مبلّغوں کا بھی کافی حصّہ ہے جو مذہبی تبلیغ یا خدا پرستی کے شوق میں عوام کی تہذیب و اصلاح کی غرض سے دور دور نکل گئے تھے اور خدا کی باتیں بندوں کو ان کی اپنی زبان میں سکھاتے پھرتے تھے۔ صوفیہ کے تذکروں میں ان کے اکثر وہ ملفوظات و اقوال نقل کیے گئے ہیں جو اس دعوے پر بطور ثبوت و دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جب ہم اُردو کے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو بیساختہ ہماری نظر امیر خسرو پر ٹھہر جاتی ہے جن کے گیت ہمارے گھروں میں آج تک گائے جاتے ہیں، جن کی پہیلیاں ہمیں اب تک یاد ہیں، جن کی کہہ مکرنیاں، جن کے بول اور جن کی کہاوتیں آج بھی ادبِ اُردو کی قدامت کے نشان ہیں۔ امیر خسرو ہندوستانی نژاد تھے۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی میں جو کچھ لکھا وہ اپنی مادری زبان میں لکھا۔ انھیں قدرت نے طبع موزوں اور قدرتِ نظم دی تھی، اس لیے وہ جو کچھ فرما گئے وہ ہمیں اب تک ازبر ہے مگر ان کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اس زبان میں کچھ نہ کچھ کہا اور سُنا ہوگا لیکن ان کی گمنامی ان کے تمام کارناموں کو لے ڈوبی۔ اس بحث میں یہ بیان کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اُردو کا حقیقی سرچشمہ ہندوستان کی کونسی بولی ہے۔ ہمارے صوبے کے لائق مصنّف اور مشہور اہلِ قلم ڈاکٹر تاراچند صاحب اُردو کی قومی اہمیت اور اس کی لسانی اصلیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"اس وقت ہندوستان میں جتنی بولیاں مروّج ہیں ان میں سے کوئی بھی سنسکرت سے نہیں نکلی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جدید ہندی سنسکرت سے مشتق ہے۔ وہ ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہماری قومی زبانوں میں کوئی بھی سنسکرت سے مشتق نہیں"

——اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تاریخی دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اُردو میں ہندو سماج کی مناسب حصّہ داری اور ان کی تمدنی زندگی کی پوری پوری نمائندگی

پائی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو اُردو کو ایک بدیسی زبان بتلانے کی جرأت کرتے ہیں ، اسی ضمن میں موصوف نے اُردو اور جدید ہندی کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں اور ایک ہی زبان کی دو شکلیں بتلایا ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ

"اُردو ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش احمقانہ اور طفلانہ ہے ۔ سنسکرت آمیز ہندی اور عربی آمیز اُردو کا پروپیگنڈا کوئی صحت ور قومی تحریک نہیں کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کے رجحان اور علیحدگی کی پالیسی کو مدد ملتی ہے ۔ ہندوستان کی مشترکہ و عمومی زبان (لنگوا فرنیکا) میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزاء کی نمایندگی ہونا چاہیئے اور اس لیے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ پیدا کرے گی جو کسی ایسی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لیے کی جائے گی جس کی بنیاد ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو"

ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلے پر آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجۂ ذیل خیالات کو بطور ثبوت پیش کیا ہے ۔ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ :۔

"مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اُردو کو اب ایک دوسرے کے قریب تر آجانا چاہیئے"

مہاتما گاندھی نے اس بحث میں اس طرح حصّہ لیا ہے کہ :۔

"میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کے ارکان دونوں بولیوں کو سیکھیں اور دونوں کے رسم الخط سے واقف ہوں اور اس کا پروپیگنڈا بھی کریں اور یہ سب اس اُمید پر کہ بالآخر دونوں مل کر ہندوستانی کے نام سے ایک بین الصوبجاتی زبان بن جائے گی ۔ پھر یہ تمیز نہ ہوگی کہ یہ ہندی ہے اور یہ اُردو ۔ بلکہ ہندی اور اُردو (جو اصلاً ایک ہی ہیں) مشترکہ ہندوستانی زبان کے طور پر ہر صوبے اور ہر گوشے میں استعمال کی جائیں گی"

حقیقت بھی یہی ہے کہ اُردو اور جدید ہندی کے افعال و مصادر، بناوٹ ، قواعد

اور دوسری لسانی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں ۔ ہزاروں محاورے باہم مشترک ہیں ۔ خیالات کے سانچے اور اظہار و بیاں کے طریقے یکساں اور یکرنگ ہیں ۔ صرف رسم الخط کا فرق ہے اور یہ فرق زبان کی اصلیت پر اثر انداز نہیں ہوتا ۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب لکھا ہے کہ :-

"اُردو ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہے ، جسے ہمارے بزرگوں نے اتحاد اور ملاپ کی نشانی کے طور پر ہم سب کے لیے چھوڑا ہے ۔ ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے اس انمول ورثے کی قدر کریں"

ہمارا سر عقیدت و ارادت کے ساتھ جُھک جانا چاہیئے ان بزرگوں کے آستانے پر جن کی پُر خلوص کوششوں نے ہماری قومی زبان کی تشکیل کی ، ہمیں مشترکہ خیالات و احساسات دیے ، مشترکہ سماجی طریقے ، مشترکہ رسمیں اور مشترکہ خصوصیتیں عطا کیں ۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلامی حکومتوں کے عہد میں ایک نئی بولی کو رواج دیا ۔ جہاں گئے اُسے سینے سے لگا کر لے گئے ، جس محفل میں بیٹھے اسی کے گُن گائے ۔ آج انھی کی کوششوں سے اُردو پشاور (سرحد) سے منی پور (آسام) اور سری نگر سے مدراس تک بولی ، سمجھی ، پڑھی اور لکھی جاتی ہے ۔

برادرانِ ہنود اپنے علمی شوق ، اپنی ذہانت اور اپنی بے نظیر قوت آخذہ کے لیے ہمیشہ سے مشہور رہیں ۔ اسلامی حکومتوں کے زمانے میں انھوں نے بہت جلد حالات کا جائزہ لے کر اپنے کو مقتضائے حال کے متناسب اور متوازن بنالیا ۔ انھوں نے فارسی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی اور عہد مغل کے شعراء کا اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے تو یقیناً ایسے ہندو بزرگوں کی کافی تعداد ہمیں ملے گی جو فارسی زبان اور شیرازی لہجے میں دادِ سخن دیتے تھے ۔ بنابریں مغلیہ عہد ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کا سنہرا عہد تھا ۔ اکبر و جہانگیر کی قومی پالیسی نے ہمیں آپس میں اس قدر قریب تر کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ قرب اپنا انفرادی وجود باقی رکھ کر ممکن نہ تھا ۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی رنگ میں شرابور اور ایک ہی کیفیت میں سرشار تھے ۔ مغلیہ حکومت خالص ہندوستانی حکومت تھی ۔ مغل بادشاہوں کے

ترکی خون میں ہندوستانی روح دوڑ رہی تھی ۔ انھوں نے ہندوستان کے درمیان سے ہر قسم کی غیریت اور بیگانگی ختم کر دی تھی ۔ مغل تاجداروں نے ہندو رسوم و عادات کو اپنا لیا تھا ۔ ان کے درباروں پر ہندو مُسلم ملاپ کا گہرا رنگ چھایا ہوا تھا ۔ مغلیہ حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے درباروں میں مسلمان شعراء اور اربابِ قلم کے پہلو بہ پہلو ہندو شعراء اور اہلِ فکر بھی دادِ سخن دیتے تھے ۔ چنانچہ اس زمانے میں ہم اکثر ہندو شعراء کے نام دیکھتے ہیں۔ چندر بھان برہمن عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر تھا ۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار ۔۔۔۔ بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

چندر بھان برہمن کا دیوان دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہا مگر تذکروں میں ان کے جتنے شعر بھی ملتے ہیں لاجواب اور انتخاب ہیں ۔ چندر بھان برہمن کے علاوہ اور بہت سے ہندو شعراء ہندوستانی قومیت کے اس سُنہرے زمانے میں موجود تھے۔ کیا عجیب لطف ہے کہ اس زمانے میں ہم اکثر مسلمانوں کو سنسکرت سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پاتے ہیں ۔ ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور عہد اکبری کے دوسرے اُمراء سنسکرت اور ہندی ادب کے بہترین ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ درحقیقت مغلیہ عہد میں تمام فرقہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے ۔ ہندو اور مسلم تہذیبیں اس طرح ایک دوسرے سے آمیز اور یکجاں ہو گئی تھیں کہ مذہب، خیالات، عقائد، فلسفے اور تاریخ کے تمام مختلف طریقے اور مظاہر فنا ہو گئے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ اکبرِ اعظم نے متحدہ ہندوستان کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بہت جلد نکل آئی اور اب تک اُردو کے بھیس میں ہمارے سامنے یادگار کے طور پر موجود ہے ۔

جس زمانے میں اکبر شمالی ہند میں اس جدید ترقی پذیر ہندوستانی قومیت کی سرپرستی اور آبیاری کر رہا تھا اُس زمانے میں جنوبی ہند کے اسلامی فرمانروا بھی اس فرض سے غافل نہ تھے ۔ عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کے درباروں پر بھی ہندوستانی اثرات چھائے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جنوبی ہند کی

اسلامی ریاستوں میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد جس قدر گہری تھی شمالی ہند کو بھی وہ خصوصیت حاصل نہ تھی اور اس کے کچھ تاریخی اسباب بھی تھے کیونکہ جنوبی ہند میں اسلامی حکومت کا قیام ایک برہمن اور ایک مسلمان کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔

دکن میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ ایک طویل داستان ہے۔ خود قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں کے فرمانروا اس نئی زبان کے سرپرست تھے۔ جب قدرت نے دکنی عظمت و اقبال کی بساط اُلٹی اور بیجاپور اور گولکنڈے کی اسلامی ریاستیں تباہ ہوئیں تو اہل کمال کا یہ جمگھٹا منتشر ہوگیا۔ مغل حکومت نے جنوبی ہند میں اپنا مستقر جاہ و اقبال اور مرکز جاہ و جلال اورنگ آباد کو قرار دیا۔ جہاں عالمگیر کے موکب شاہی کے ساتھ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے تمام ارباب فضل و کمال اور شعراء جمع ہوگئے۔

جدید اُردو ادب کا باوا آدم ولی دکنی کو سمجھا جاتا ہے (اگرچہ محققانہ زاویۂ نگاہ سے یہ صحیح نہیں) ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ بتلایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اورنگ آباد ان کا آبائی وطن نہ ہو لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اورنگ آباد اسکول کے ایک نامور رکن تھے۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کے تمام ادبی حلقے اس نئی زبان کے ترانوں سے گونج رہے تھے مگر شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چلتا تھا اور شمالی ہند کے ہندو اور مسلم ارباب کمال اردوئے معلیٰ میں کچھ کہنا اپنے علم وفضل کی توہین سمجھتے تھے۔ وہ اگر کبھی اس نئی زبان میں کچھ کہتے بھی تھے تو بہ سبیل نشاط و تفنن ——— لیکن جنوبی ہند میں دکنی اُردو کا ہی بول بالا تھا۔ وہاں بادشاہ، اُمراء اور عوام اپنی زبان ہی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ولی دکنی کا جنوبی ہندوستان سے دہلی آنا اُردو تاریخ کا ایک سُنہرا باب ہے۔ ولی اپنے ساتھ اپنا اُردو دیوان بھی لائے اور اس شان سے آئے کہ دہلی میں ولی ہی ولی نظر آنے لگے۔ ہمیں اس موقع پہ اُردو کی مفصل تاریخ پر نظر ڈالنا نہیں ہے۔ سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کا منشا صرف اتنا تھا کہ عہد مغل کی ادبی روح بے نقاب ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس زمانے کی ادبی فضا، قومی اشتراک

اور ذہنی اتحاد کا کتنا مکمل نمونہ اور کتنا شاندار منظر تھی۔

اب ہمیں اس بحث میں ایک خاص نقطے تک پہونچنا ہے۔ یوں تو ہندوستانی قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت نے اپنی پیاری زبان اور اپنے قومی ادب کی تشکیل میں حصہ لیا لیکن اگر ہم اُردو ادب کے مشاہیر شعر و سخن کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو ہمیں یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ اُردو شعراء کے ہندو طبقے میں کایستھ اور براہمنۂ کشمیر کا جس قدر حصہ ہے، اس کی مثال ہماری سوسائٹی کا کوئی دوسرا حلقہ مشکل ہی سے پیش کرسکتا ہے۔ کایستھ حضرات اور کشمیری پنڈتوں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے اُردو ادب پر غیر معمولی احسانات کیے۔ ان دونوں برادریوں میں اُردو فارسی کا ذوق اب تک عام ہے۔ آپ آج بھی کشمیری خاندان میں بہت سے فضلاء اور ادباء کو پاسکتے ہیں۔ کشمیر کی صحت مند، توانا اور ولولہ خیز آب و ہوا بے اثر نہیں رہ سکتی۔ کشمیر کی جو فردوس بداماں وادیاں، روح پرور پھول کھلاتی ہیں وہ ولولہ خیز دل و دماغ بھی پیدا کرتی ہیں۔ عرفی نے کہا ہے

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید   گر مرغ کباب ست کہ با بال و پر آید

اللہ اللہ جس سرزمین بہشت آئین میں یہ خصوصیت ہو کہ وہ مرغ کباب کو دولت بال و پر اور مشت خاک کو نعمتِ برگ و ثمر بخش دے، وہ انسانی دل و دماغ، انسانی ذہن و روح بلکہ انسانی وجدان و ضمیر کو کن کن الہامی طاقتوں اور روحانی تازگیوں سے معمور نہ کردیتی ہوگی۔ کشمیری پنڈت اپنی غیر معمولی ذہانت، اپنی طبعی ذکاوت اور اپنی جودتِ فکر کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اسی خانوادۂ علم و ادب اور گہوارۂ ذہانت و ذکاوت سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی آپ اصلاً کشمیر کے ایک معزز برہمن خاندان کے رکن تھے۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں اپنے اس تعلق کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

علامۂ اقبال مرحوم کو اُردو اور فارسی ادبیات کی تاریخ میں جو بلند پایہ اور غیر فانی مقام حاصل ہے اس کا اظہار بے سود ہے۔ علامۂ اقبال سے قطع نظر کشمیری پنڈتوں کی

تاریخ اُن ناموروں کے تذکروں سے معمور ہے جو ہمارے لٹریچر میں بلند ترین درجہ رکھتے ہیں - اُردو کا کون بھی خواہ ایسا ہوگا جس کا سر عقیدت اُردو نثر کے زندۂ جاوید ادیب اور اُردو افسانہ نگاری کے موجد و پیشرو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سامنے خم نہ ہو جائے، جن کا فسانۂ آزاد اور سیر کوہسار اُردو ادب کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے سماجی زندگی کی تصویر کشی کی اور کردار نگاری کے اصول سے آشنا کیا - اگر اُردو ناول نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کو اولیّت یا اولویت کا درجہ حاصل ہے تو اُردو مثنوی نگاروں کی تاریخ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام نامی بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں، جن کی مثنوی گل بکاؤلی، حسنِ بیاں، شکوہ ادا، نزاکت تخئیل، کمال فن، قدرت سخن اور محاسن لفظی و معنوی کا ایک جمیل شاہکار ہے - یوں تو اُردو زبان میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر جو شہرت اور مقبولیت سحر البیان اور گلزار نسیم کو حاصل ہوئی اس کی مثال نہیں مل سکتی - ان میں سے اوّل الذکر مثنوی خدائے سخن میر انیس کے جد مرحوم میر حسن کی رعنائیِ فکر کا نتیجہ ہے اور ثانی الذکر پنڈت دیا شنکر نسیم کی موزونیت طبع کا شاہکار ——— پنڈت دیا شنکر نسیم کے بعد ادبی دنیا میں چکبست کا نام آتا ہے جو براہمنۂ کشمیر کے نامور رکن تھے - چکبست کا مقام ہمارے شعرا میں کس درجہ بلند ہے؟ اس حقیقت کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ مرحوم متاخرین شعرائے اُردو کے اس طبقے میں تھے جو جدید رنگِ سخن کے اعتبار سے سخنورانِ متقدمین میں شمار ہوتا ہے - یعنی چکبست بھی اقبال، اکبر، حالی، اور شوق قدوائی کی ادبی بزم کے معزز رکن تھے - ان کی شاعری کا پس منظر قومی احساس کی کارفرمائی اور ہندوستان کے سیاسی انقلابات پر مشتمل ہے - پنڈت چکبست پر لکھنؤ کی سرزمین بجا طور پر نازاں ہے - چکبست کی نظمیں، چکبست کے مقالات اور چکبست کے مضامین، غرض چکبست کا تمام مجموعۂ نظم و نثر، علوئے تخئیل، عذوبت بیان، گیرائی نظر، ہمہ گیری طبع، حسنِ ادا اور لطافت اظہار کا ایک طلسم ہے - عہد جدید میں کون ہے جو سر تیج بہادر سپرو، علامہ برج موہن دتاتریہ اور پنڈت موتی لال مرحوم کی سیاسی ذہانت، ادبی خدمات اور قومی جوش و خروش کو نظر انداز کر سکے - پنڈت موتی لال مرحوم آج اگرچہ

ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے لائق فرزند اور ہندوستان کے جلیل القدر رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے والد بزرگوار کے ذوق علم و ادب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ :۔

"بچپن میں انھوں نے رواج کے مطابق عربی و فارسی تعلیم حاصل کی تھی اور تمام عمر مشرقی لٹریچر کے مطالعے کا شوق انھیں دامنگیر رہا۔ اس معاملے میں اُن کی نظر بہت وسیع اور معلومات ہمہ گیر تھیں ۔ وہ قدیم ہندوستانی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے"

——خود پنڈت جواہر لال نہرو کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے ایک فارسی عربی داں منشی کے زیر اہتمام ہوئی تھی، جن کی شاندار داڑھی اور غدر کے بیان کردہ درد انگیز افسانوں کا تذکرہ پنڈت جی نے کمال دلچسپی سے اپنی سوانح عمری میں کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے مورثِ اعلیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ :۔

"ہمارے مورثِ اعلیٰ کو فرخ سیر بادشاہ دہلی اپنے ہمراہ کشمیر سے لائے تھے۔ وہ عربی فارسی کے علامہ تھے اور ہمارے خاندان میں ان کی جو تصویر محفوظ ہے وہ مغلیہ لباس میں ہے۔ اس تصویر میں وہ ایک شاندار مغل کے روپ میں نظر آتے ہیں"

ان بیانات سے کشمیریوں کی سماجی زندگی، مشترکہ ہندوستانی قومیت سے ان کا لگاؤ اور عربی فارسی کی طرف ان کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو فقط ملک کے ایک سر کردہ مدبر اور مقنن ہی نہیں ہیں بلکہ انجمن ترقی اُردو کے صدر مستقل بھی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کو اپنی قومی زبان، اُردو سے جو شغف ہے اس سے اُردو کا ہر بہی خواہ واقف ہے۔ اکیلے سر تیج بہادر سپرو نے اُردو کے لیے جو کام کیا ہے اُسے ہزار آدمی بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ تمام ہندوستانی رہنماؤں میں سر تیج بہادر سپرو کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ زبان کے مسئلے کو اس کی صحیح اسپرٹ میں دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مشترکہ تمدنی ورثے کی حفاظت میں زبان اور قلم دونوں سے جہاد کرتے رہتے ہیں۔ علامہ برج موہن دتاتریہ

تو مجتہد ادب اور امام فن کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ علمی نقادوں اور ادبی کارکنوں کی صف میں ان کے علمی ذوق اور ادبی سرگرمی کا جواب مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ یہ تو وہ نام ہیں جو کشمیری ادیبوں کے تذکرے میں بے ساختہ زبانِ قلم پر آ گئے۔ ان کے علاوہ کتنے ہی ادیب، کتنے ہی اہلِ قلم اور کتنے ہی مفکر اس خانوادۂ علم و ادب میں پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ آج مغربی علوم کی گرم بازاری نے عام ہندوستانیوں میں مشرقی ادبیات کا ذوق و شوق بہت حد تک کم کر دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیری اربابِ مذاق کا تعلق ہے وہ مغربی علوم میں دستگاہ کامل اور مہارت تام حاصل کر لینے کے باوجود بھی اپنے مشرقی علوم سے کسی نہ کسی حد تک دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں ؎

کسیکہ محرم بادِ صباست می داند　　کہ باوجود خزاں بوئے یاسمیں باقیست

ہمارے ممدوح پنڈت سندر نراین مشران مرحوم کا تعلق بھی اسی نامور علمی برادری سے تھا۔ پنڈت جی کی نظر کس قدر عمیق، فکر کس درجہ روشن اور ادبی فطرت کتنی ہمہ گیر اور رنگ رنگ تھی، اس کا اندازہ تو خطباتِ مشران کے مطالعے ہی پر موقوف ہے، لیکن ان کی زندگی بھی علم و ادب اور خدمت و ایثار کے اعتبار سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے اور وہ ہر وقت ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ آئیے ان کے کمالاتِ ادبیہ اور نوادرِ علمیہ کے تذکرے سے قبل پنڈت جی کی حیاتِ مستعار کے بعض پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں کہ اسلاف کی زندگی اخلاف کے لیے ایک درسِ عمل، ایک اسوۂ ترقی اور ایک سیرتِ تمثیلی ہوتی ہے، جس کے آئینے میں آنے والی نسلیں اپنے خد و خال اور اپنے مستقبل کے نقش و نگار کا مشاہدہ کیا کرتی ہیں ؎

نام نیک رفتگاں ضایع مکن　　تا بماند نام نیکت یادگار

پنڈت سندر نراین مرحوم فرخ آباد کے ایک معزز و موقر خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے ایک ایسی فضا اور ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جو علم و ادب کے تذکروں سے معمور تھا۔ ان کے والد ماجد پنڈت لچھمی نراین مشران، فرخ آباد کے مشہور رئیس اور بزرگ تھے۔ آپ کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور مفتوں تخلص

فرماتے تھے۔ پنڈت لچھمی نراین مشران مرحوم سماجی اعتبار سے بھی ایک بلند پوزیشن رکھتے تھے۔ آپ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر ہونے کے باوجود انتہائی سادہ مزاج اور درویش صفت انسان تھے۔ اس اعتبار سے شعروادب کا علمی و ادبی ذوق پنڈت سُندر نراین مشران مرحوم کے لیے نہ صرف ذاتی اور انفرادی دلچسپی کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ وہ ان کے والد بزرگوار کا روحانی ترکہ اور معنوی ورثہ بھی تھا، جس کی قدر و قیمت صرف وہی محسوس کرسکتے تھے۔ خود بھی اپنے والد مرحوم کی طرح علوم عربیہ میں دستگاہ رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کے خطبات و تقاریر کے حرف حرف سے ملتا ہے۔

پنڈت مشران مرحوم کا دل دردِ قومی اور سوز و گدازِ ملّی کا آتشکدہ تھا۔ انھیں سماجی اصلاح اور خدمت ملک و وطن کی سچی دُھن تھی۔ وہ فطرۃً ایک اعتدال پسند اور روشن خیال انسان تھے۔ شروع ہی سے انھوں نے اپنے آپ کو قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا اور چونکہ وہ انتہا پسندانہ اور جذباتی ہنگاموں سے گریز کرتے تھے اور جذبات کی اندھا دھند رہنمائی کے بجائے عقل و شعور کی روشنی میں قدم اُٹھانے کے عادی تھے، اسی لیے پبلک کے ہر طبقے میں ان کی قدر تھی۔ حکام ان کے پُرخلوص تعاون کے خواستگار رہتے تھے اور عوام ان کی مدبرانہ رہنمائی کے اُمیدوار۔ اپنے مُلک کے اخلاقی انحطاط اور دماغی زوال کو دیکھ کر ان کا حساس دل برداشت نہ کرسکا اور انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات خطبات کے ذریعے ادا کرنا شروع کیے۔ سچائی ضایع نہیں جاتی، خلوص رائگاں نہیں ہوتا، پنڈت جی کی زبان پر سچائی، دل میں خلوص اور ہر تیور میں عزمِ صمیم کی جھلک تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ ان کی عظیم شخصیت اپنے معاصرین سے اپنی اہمیت و جامعیت کا لوہا نہ منوالیتی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ فرخ آباد کی سب سے زیادہ محبوب شخصیت بن گئے اور ہر انجمن ان کے تذکروں سے اور ہر سبھا ان کے چرچوں سے معمور نظر آنے لگی ؎

زفرق تا بہ قدم، ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مرحوم کو قدرت نے فقط جادو نگار قلم ہی نہیں دیا تھا بلکہ سحرکار زبان بھی عطا کی تھی۔

اور تحریر و تقریر کی یہ جامعیت اور زبان و قلم کی یہ مہارت بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ آپ ہر بزم کی رونق اور ہر سبھا کا سنگھار تھے۔ عوام و خواص آپ کی تقریر سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ جب کسی جلسے میں آپ کی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو پبلک کا ذوق و شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کی تقریر، فصاحت و بلاغت، حُسن بیاں اور تاثیر ادا کا ایک طلسم ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ و معانی کا ایک بحر بیکراں ہے کہ اُبل رہا ہے۔ آپ کو لفظوں پر قدرت کامل اور ادائے خیالات کی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ بولتے تھے اور بولتے چلے جاتے تھے اور تقریر کے دَوران میں تاریخی لطائف اور ادبی نکتے، اس خوبی سے پیش کرتے جاتے تھے کہ مجمع پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خشک سے خشک موضوع کو آپ کی سحر بیانی اور ہمہ دانی رنگین اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔

آپ کی تقاریر میں کس قدر ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور دلائل و براہین کی دروبست، موضوع سے مطابقت اور علمی مواد کی کس درجہ فراوانی ہوتی ہے؟ اس کے ثبوت میں یہی خطبات پیش کیے جا سکتے ہیں، جن کے متعلق یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ اپنی اصل شکل میں ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی گئی۔ پنڈت جی کی زبان سے جو لفظ جس نہج و اسلوب سے ادا ہوا تھا، اس مجموعے میں وہ اسی نہج و اسلوب سے موجود ہے۔ درحقیقت یہ مرحوم کی تقاریر کا اصلی ریکارڈ ہے۔ انصاف کیجیے، کیا کسی معمولی اور غیر قادرالکلام خطیب اور مقرر میں یہ روانیِ بیان اور یہ تسلسل ادا پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے؟

آپ کی درخشاں زندگی کی یہ خصوصیت بیان کرنا لازم ہے کہ آپ قومی امراض کے صرف نبّاض ہی نہ تھے بلکہ چارہ گر بھی تھے۔ جہاں آپ کی زبان دردِ قومی کی مرثیہ خوانی کرتی تھی، وہاں آپ کا ہاتھ عقدہ ہائے ملک و ملت کا گرہ کشا بھی تھا۔ دنیا میں علم و عمل کا امتزاج بہت کم دیکھا گیا ہے۔ فردوسی نے سیستان کے ایک شہزور کو قولاً رستم بنا دیا ہے

منش کردہ ام رستم داستاں ۔۔۔ وگرنہ یلے بود در سیستاں

——مگر عملاً خود دربار غزنوی سے اپنے لیے انصاف بھی نہ حاصل کر سکا۔ مقصد یہ ہے کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے مگر پنڈت مشران مرحوم کی زندگی علم و عمل کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اور محسوس کرتے تھے اُسے کرتے اور عمل میں بھی لاتے تھے۔ پنڈت جی تمام عمر فرقہ وارانہ کشمکش اور جماعت بندی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے مگر انھوں نے ع

نشستند و گفتند و برخاستند

پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ فرخ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے یونٹی بورڈ قائم کیا اور عرصے تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ درحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی قول و فعل کی صحیح عظمت اپنی پوری شان سے نظر آتی ہے۔

یوں تو مرحوم نے اپنے ادبی ذوق کی بہترین یادگار خطبات کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑی ہے لیکن فرخ آباد پبلک لائبریری کا ذرہ ذرہ بھی آپ کی علمی خدمات کا ایک مستقل نقش پیش کر رہا ہے۔ محض علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور پبلک کے مذاق کی اصلاح کے لیے، آپ نے ۱۸۹۹ء میں اس لائبریری کا سنگ بنیاد رکھا اور اپنی زندگی ہی میں اس کی ترقی و بقا کے تمام سامان فراہم کر دیے۔ جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو ۱۹۳۲ء میں پبلک نے اعتراف خدمات کے طور پر لائبریری ہال میں پنڈت جی کے نام کا سنگ یادگار نصب کر دیا، جو ابد الآباد تک علم و ادب کے ساتھ مشران کی وابستگی کا مستقل و مستحکم ثبوت دیتا رہے گا۔ آپ نے اس لائبریری میں ہر علم و فن اور ہر زبان و ادب کی بہترین کتابیں جمع کر دی ہیں اور اس لائبریری کے ذخائر علم و ادب اور نوادر حکمت و تحقیق کو دیکھ کر پنڈت جی کے ذوق انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس لائبریری کا محل وقوع بھی بہت دلچسپ اور پُربہار ہے۔ شاید حافظ کے اس مصرع کا صحیح استعمال اسی مقام پر ہو سکتا ہے کہ ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو نے آپ کی خدمات کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا کہ

"مشران صاحب تاریخ ، فلسفہ ، سیاست ، ادب اور عمرانیات کے بہترین عالم ہیں، جن کی ادبی و علمی خدمات فرخ آباد میں پبلک لائبریری قائم کرنے اور اس کی بقا کے اسباب فراہم کرنے کے باعث کبھی فنا نہیں ہو سکتیں"

یہ پنڈت موتی لال نہرو کے الفاظ ہیں، جو اُن دماغوں میں سے تھے جن پر ہندوستان کو بحیثیت مجموعی آج تک فخر ہے -

مشران مرحوم بہ حیثیت انسان بھی اپنی مثال آپ ہی تھے - حد درجہ سیر چشم ، مہماں نواز ، متواضع اور خلیق - ان کا مکان اہل کمال کا مرکز تھا اور ان کی صحبت بزرگانِ سلف کی بزم آرائی کا نمونہ ، فرخ آباد کے تمام ادارے بلا امتیاز مذہب و ملت ان کے دستِ کرم کے ممنون اور چشمِ التفات کے محتاج تھے - وہ قومی کاموں میں جی کھول کر حصہ لیتے تھے اور شاید ہی ملک کی کوئی ایسی مفید تحریک ہو جس میں مشران مرحوم پیش پیش نہ رہے ہوں اور اپنی انتھک کوششوں سے اپنے دائرۂ اثر میں اسے کامیاب نہ بنایا ہو -

پنڈت جی فطرۃً معتدل اور احتیاط پسند دل و دماغ کے مالک تھے اور غالباً وہ تمام ہندوستانی رہنما ، جو بعد میں سیاسی اعتبار سے انتہا پسند اور باغی کہے جانے لگے ، اپنی پبلک زندگی کے آغاز میں اعتدال پسند سیاست دانوں میں شمار ہوتے تھے - گاندھی جی کی سیاسی زندگی کا یہ واقعہ دلچسپی سے سُنا جائے گا کہ پچھلی جنگِ عظیم میں انھیں جنگی خدمات کے صلے میں خوشنودی سرکار کا پروانہ اور تمغا ملا تھا ، مگر پچھلی لڑائی ختم ہونے کے بعد جو سنگین واقعات رولٹ ایکٹ ، پنجاب کی فوجی بھرتی اور جلیانوالہ باغ کی خونچکاں شکل میں پیش آئے ، انھوں نے ہندوستانی لبرل اِزم کا خاتمہ کر دیا اور ماضی کے اعتدال پسند حال و مستقبل کے سب سے بڑے باغی اور انتہا پسند بن گئے - پنڈت سندر نراین مشران نے گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر مساعی جنگ کے سلسلے میں جو تقاریر کی تھیں وہ اس مجموعے کا اہم حصہ ہیں - ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۸ء تا ۱۹۲۱ء کے حادثات سے قبل وہ سیاسی حیثیت سے کس نظریے پر عامل تھے اور کس درجہ سلامت روی ، سنجیدگی اور خود ضبطی ان کا شعار تھا - لیکن لڑائی ختم ہونے پر ملک میں جو سیاسی زندگی شروع ہوئی

اور پنجاب میں جو حادثات پیش آئے انھوں نے پنڈت جی کے صبر و احتیاط کے بند توڑ کر جذبات کی سیل تند رو کو آزاد کر دیا۔ جس طرح جلیانوالہ باغ کے سانحۂ خونیں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے سر، کا خطاب حکومت ہند کو واپس کر دیا، اسی طرح پنڈت جی نے بطور احتجاج سرکاری اعزاز و مناصب ترک کر دیے اور آنریری مجسٹریٹی اور منصفی سے دستبردار ہو گئے۔

ایک مرتبہ سیاست کے میدان میں اُترنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ مشران کسی سے پیچھے رہیں۔ اب وہ کانگریس کی روح رواں تھے۔ تحریک خلافت کے دست و بازو تھے۔ نوجوان ان کی جرات عمل پر دنگ اور پیران آزمودہ کار ان کے جوش و خروش پر انگشت بدنداں تھے۔

بہت کم مشاہیر دنیا میں ایسے گزرے ہیں جن کی مَوت بھی ان کی زندگی کی طرح شاندار اور پُرعظمت ہو۔ مشران کی مَوت بھی ان کی زندگی کی طرح موقر اور یادگار تھی اور یہ ان کی خصوصیت بھی بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔ ۷، ارجنوری ۱۹۳۷ء کو فرخ آباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ تھا۔ جس کی شرکت کے لیے دیگر اربابِ کمال کے علاوہ، شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی بھی فرخ آباد تشریف لائے ہوئے تھے۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ سخن فہموں، سخن سنجوں اور سخن گویوں کے اس بلند پایہ اجتماع کی مسند صدارت پر مشران جلوہ گر تھے۔ مشاعرے کا آغاز پورے ذوق و شوق اور جوش و خروش کے عالم میں ہوا۔ مشران خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ موزوں لفظوں میں شعرا اور اربابِ سخن کا تعارف کرایا، پھر مشاعرے کے اغراض و مقاصد واضح کیے۔ اس کے بعد ادبِ اُردو پر ایک عالمانہ تقریر شروع کی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس وقت پنڈت جی پر عجب کیفیت طاری تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی تمام روح لب و دہن میں سمٹ آئی ہے اور علم و حکمت کے دریا بہا رہی ہے۔ درمیان میں جا بجا موزوں اور برجستہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔ خود بھی وجد میں تھے، سامعین بھی وجد و کیف کے عالم میں تھے۔

کہ ناگہاں مشران کی زبان سے ایک شعر ادا ہوا اور خاموشی چھا گئی ۔ لوگوں نے سمجھا کہ وجد و حال کا غلبہ ہے مگر حقیقت اور کچھ تھی ۔ زندگی کا ساز آخری نغمے کے بعد خاموش ہو گیا ہے

ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا
مر گیا ۔ صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ

کیا ایسی شاندار موت کسی اور شاندار زندگی کو بھی نصیب ہوئی ہے ؟ کیا شعر و ادب کی محفل میں کسی اور شاعر و ادیب نے بھی یوں جان دی ہے ؟ بیشک شہیدِ ادب کا خطاب مشران ہی کے لیے ہے اور وہ واقعی شہیدِ ادب تھا بھی ۔

یقیناً مشران کی موت قابلِ فخر موت ہے ۔ اگر زندگی فنا او زوال کی کشمکش سے آزاد بھی ہوتی تب بھی جینے والے ایسی موت کی خواہش کرتے ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خطباتِ مُشران پر ایک تنقیدی نظر!

تمہید ۔ فن خطابت ۔ ادب و سماج ۔ اُردو کے محرکات ارتقاء اور اسباب ظہور ۔ اُردو میں ہندو مسلم ادباء کا حصّہ ۔ ہندوستانی قومیت اور مشترکہ سماج کی تشکیل ۔ نونہالانِ کشمیر کی ادب نوازیاں اور پنڈت مشران مرحوم کی زندگی کے خصوصیات ۔ ان تمام ابتدائی اور وسطی مرحلوں سے گزر کر اب ہم اس بحث کے اختتامی یا مرکزی نقطے تک پہونچ رہے ہیں ۔ اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ اُردو کی تاریخی اہمیت اور پنڈت جی کی انفرادی خصوصیات کی ایک دلچسپ داستان تھی ۔ ناگزیر تھا کہ مُشران کی ادبی روح اور ان کے خطبات کی صحیح اور حقیقی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان تمام نقاط بحث کو چھیڑا جائے ۔ کیونکہ ہم نے اپنے ممدوح (ہیرو) کو ایک ایسے ادیب کی شکل میں پیش کیا ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا مکمل نمونہ اور ادب اُردو کا سچا خادم تھا ۔ ہم نے اس بحث کا خاصہ حصّہ ایک خاص مسئلے کی تشریح و وضاحت میں صرف کر دیا ہے ۔ وہ مسئلہ بدقسمتی سے

اُردو اور ہندی کے فرقہ پرستانہ تصادم کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے ڈاکٹر تارا چند اور سر تیج بہادر سپرو کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں۔ اب ہم پنڈت مُشران مرحوم کے زاویۂ نظر کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

تاریخی طور پر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ زبان جس کو ہم لوگ، اُردو، ہمارے بزرگ ہندی اور غیر ملکی ماہرین السنہ (گیرسن و تاسی وغیرہ) ہندوستانی کہہ کر پکارتے ہیں، کوئی بدیسی بولی نہیں ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانی پیداوار ہے۔ جس میں ایرانی، ترکی، عربی اور بعد کو عربی ادبیات کی رنگ آمیزیاں شامل ہوگئی ہیں۔ یہ زبان یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان پڑھی اور یہیں بولی جاتی ہے۔ آپ اسے اُردو کے نام سے پُکاریے یا ہندی کہیے۔ ناموں کی تبدیلی سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ زبان ہزار برس کی سماجی ترقیوں اور تمدنی ملاپ کا نتیجہ ہے۔ آئیے دیکھیں، پنڈت مشران اس مسئلے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ آپ نے ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے اُردو ہندی مسئلے پر ان لفظوں میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ:۔

"لوگ آج کل اُردو ہندی کے سوال کو مذہبی رنگ میں پیش کرکے غلامانہ ذہنیت کی بنیادیں مستحکم کر رہے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی زبان کاٹنے پر تُلا ہوا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر دونوں گونگے ہوگئے تو متمدن اقوام کی نظر میں ہندوستان کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ ہم کو قومی تعمیر اور ملکی تنظیم کے لیے اس غیر ضروری سوال کو چھوڑ کر دوسری سیاسی گُتھیوں کے سلجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اُردو کہو یا ہندی، میرے خیال میں یہ دونوں ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ اگر اُردو کو عربی اور ہندی کو سنسکرت نہ بنایا جائے تو نتیجے میں ہم ہندو اور مسلمانوں کی زبان وہی ایک رہ جاتی ہے، جو مصلح قوم اکبر اعظم کی تربیت کردہ اور ہندو مسلمان اتحاد کی بولتی ہوئی یادگار ہے"

درحقیقت پنڈت جی کے متذکرۂ بالا الفاظ ہماری تمام خامہ فرسائی کا نچوڑ ہیں۔

پنڈت جی نے اکبر اعظم کی مساعی اتحاد کی طرف اشارہ کرکے ہندوستان کی پچھلی تاریخ کے اُن پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے جن پر ہم سطور بالا میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ آپ نے اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا ہے اور تاریخی اعتبار سے صحیح تر بھی یہی ہے کہ ہندی اور اُردو کی لسانی بناوٹ میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبات میں جابجا اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خود ان کے خیالات، اس حقیقت کی واضح تفسیر تھے۔ پنڈت جی کو اسلامی تاریخ، اسلامی ادبیات اور اسلامی روایات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے کس طرح ہندوستانی قوموں کے اتحاد کے لیے روایات، تہذیب، عقائد، فلسفہ اور خیالات کے مشترک سانچے بنائے تھے اور انہی مشترک سانچوں میں قومیت متحدہ کی پرورش ہوئی، جو آج ہم سب کے لیے باعث افتخار ہے۔

پنڈت جی کے خطبات و تقاریر کا مطالعہ، گہرے ادبی مسائل کی واقفیت اور علمی، تاریخی نکات کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ آپ چٹکلوں میں وہ گُر بتا جاتے ہیں جو مستقل علمی تصانیف کی ورق گردانی کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ان خطبات کے مطالعے سے نظر میں وسعت اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

خالی از دلچسپی نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں پنڈت جی کے بعض خطبوں کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے جائیں۔ آپ نے شعر و شاعری کی عظمت پر جو خطبہ ۲۸ اپریل ۱۹۲۸ء کو ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، حقیقتہً وہ بجائے خود ایک جامع مقالہ ہے جو فن شعر کی عظمت اور شعراء کے انداز بیان پر تحقیقی روشنی ڈالتا ہے۔ ضمنی طور پر اس خطبے سے پنڈت جی کے زور بیاں اور تسلسل کلام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص بغیر کسی تحریری یادداشت کی مدد کے، اتنے اہم موضوع کو کمال خوبی اور تسلسل سے کس طرح بیان کر سکتا ہے۔

آپ نے اس خطبے کے آغاز میں شعراء کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ عرب اپنے شاعروں کو کس قدر عزیز و قابل فخر سمجھتے تھے۔ مثال میں پنڈت جی نے

کسی شاعر کا ایک شعر پیش کیا ہے جس سے شاعر کی قدرت وطاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ ؎

یکے را زمہ اندر آرم بچاہ ۔ یکے را زچہ برفرازم بماہ

—— جس کو چاہوں خاک میں ملا دوں اور جس کو چاہوں آسمان پر بٹھا دوں۔ عربی شعراء کے اثر و اقتدار کے تذکرے کے بعد، آپ نے عجمی شعراء کا تذکرہ کیا ہے اور بطور مثال فردوسی اور محمود کا واقعہ پیش کیا ہے کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتوں کا نام و نشاں مٹا دیا اور بڑے بڑے سلاطین کی ہستی کو خاک میں ملا دیا مگر دہقان[1] زادۂ طوس یعنی فردوسی کے چند شعر نہ مٹا سکا جو اس نے محمود کی ہجو میں کہے تھے۔ بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا ۔ بماند ہجا تا قیامت بجا

پنڈت جی کی تاریخی نظر بہت وسیع اور بہت ہمہ گیر ہے۔ یہی نہیں کہ عربی و عجمی شعرا کے حالات ہی ان کے پیش نظر ہیں بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ہر ورق بھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ چنانچہ اسی خطبے میں وہ ہندوستانی درباروں کی شاعر نوازی اور شعر فہمی پر ان لفظوں میں روشنی ڈالتے ہیں کہ :-

"سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایران کے بڑے بڑے شعراء اپنا وطن مالوف چھوڑ کر ہندوستان کھنچے ہوئے چلے آتے تھے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانے کو اپنا قبلۂ مراد قرار دے دیا تھا۔ مغل سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب و زینت سمجھتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔"

ان تاریخی واقعات کے اعادے کے بعد آپ نے حقیقت شعر کے علمی موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ آپ کے اپنے الفاظ میں :-

"صاحبو! میں نے شعر و شاعری کی عظمت اور شعراء کی قدر و منزلت آپ کی خدمت میں عرض کی۔ اب میں شعر کی حقیقت مختصراً بیان کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں

---

[1] غزنوی شعراء نے ازراہِ تحقیر فردوسی کو یہی خطاب دیا تھا ۱۲

وہ سناؤں گا"

——— خطبے کا یہ حصہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ (کاش سننے کا موقع ملتا!) آپ نے ماہیت شعر کی وضاحت ارسطو کے بیان سے کی ہے جس کی غیر فانی کتاب "بوطیقا" فنِ شعر پر دنیا کی اہم ترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ ارسطو نے شعر کی جو تعریف کی ہے اُسے آپ نے بیان کیا ہے :-

"شعر ایک قسم کی نقالی یا مصوری کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور مادی اشیاء کی تصویر کشی کرتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات و خیالات کی مصوری پر قادر ہے"

اس کے بعد آپ نے ادبی کتابوں میں شعر کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یعنی :-

"وہ کلام جو متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو"

——— پھر اس منطقی تعریف کی جرح و تعدیل کر کے نظامی عروضی سمرقندی کے خیالات پیش کیے ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جان اسٹوارٹ مل نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کا ایشیائی ناقدوں کی تعریف سے موازنہ کیا ہے اور اصل حقیقت اس طرح ظاہر کی ہے کہ :-

"شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب نے بیان کیا ہے اور نہ اس قدر وسیع ہے جتنا علمائے عرب و عجم کی تعریف سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ شعر کی ماہیت وہی ہے جو ارسطو نے بیان کی ہے یعنی جذبات انسانی اور مناظر قدرت کی تصویر کشی"

——— اس کے بعد پنڈت جی نے اصول بلاغت کی رو سے شعر کی تحلیل کی ہے اور بتلایا ہے کہ شعر دراصل شعور و احساس کا نام ہے لہٰذا شاعر وہی ہے جو احساسات و تاثرات کی صحیح اور قدرتی ترجمانی کر سکے۔ ماہیت شعر کے بیان کے بعد آپ نے اجزائے ترکیب شعر کا ذکر کیا ہے کہ شعر دو[2] عناصر پر مشتمل ہے، مادہ اور صورت، مادہ

یعنی مضمون اور صورت یعنی ترکیب و بندش ۔ اسی ضمن میں محاکات اور تخئیل پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے اور محاکات اور مرقع نگاری کے درمیان جو فرق ہے اُسے واضح کیا ہے ۔

مرقع نگاری کی مثالیں آپ نے سکندرنامے اور شاہنامے سے پیش کی ہیں اور فردوسی کے کمالات سخن کو جی کھول کے سراہا ہے اور یہ آپ کی سخن فہمی کی روشن دلیل ہے ۔ پنڈت جی نے فردوسی اور نظامی کے درمیان ایک مرقع نگار اور فطرت شناس شاعر کی حیثیت سے جو فرق بیان کیا ہے اور جن قوی دلیلوں سے فردوسی کی عظمت سخن ظاہر کی ہے وہ موقع لاجواب ہے ۔ یہ تمام چیزیں اگرچہ علامہ شبلی نے شعرالعجم میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں مگر دونوں میں حال و قال کا فرق ہے ۔ پنڈت جی نے اُن تمام دلائل کو نئے انداز سے اپنے خطبے میں پیش کیا ہے اور جا بجا اپنی ذاتی بصیرت و اجتہاد سے کام لیا ہے ۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل سے ان بحثوں کو دُہرا سکیں اور نہ شاید اس کی ضرورت ہی ہے ۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ پنڈت جی کے خطبات ادبی نقطۂ نظر سے کس قدر جامع اور تاریخی اعتبار سے کس قدر مکمل ہیں ــــــ

پنڈت جی کی سخن شناسی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُردو شعرا میں ان کا محبوب انیس ہے ۔ انھوں نے انیس کو ہر موقع پر بطور مثال پیش کیا ہے ۔ انیس کی فطرت شناسی انیس کی واقعہ نگاری ، انیس کی منظر کشی ، انیس کی رفعت تخئیل ، غرض انیس کی شاعری کے ہر ہر پہلو کو ہر ہر موقع پر بے نقاب کرتے ہیں اور اپنی ادبی صلاحیتوں کا شاندار ثبوت دیتے چلے جاتے ہیں ۔ چنانچہ اس خطبے میں بھی آپ نے جا بجا انیس کے مرثیوں سے مثالیں دی ہیں اور ضمناً شہدائے کربلا کا اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ان کی تاریخی بصیرت اور معلومات پر بے ساختہ تحسین و آفریں کرنے کو جی چاہتا ہے ۔ شعر کی ماہیت و ترکیب کے بیان اور مکمل بیان کے بعد ضمناً آپ نے ایشیائی شاعری پر اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ

"ایشیائی شاعری اخلاقی اور اصلاحی خیالات و مضامین سے تہی دامن ہے اور دور از کار باتوں سے بھری پڑی ہے"

ــــــ اس اعتراض کا جواب پنڈت جی نے جس قابلیت اور وسیع النظری سے دیا ہے

وہ حصہ دیکھنے کے قابل ہے ۔ معترض کو یہ بتانے کے لیے کہ ایشیائی شاعری کا دامن اخلاقی موتیوں سے خالی نہیں ہے ، پنڈت جی نے متعدد شعر پیش کیے ہیں اور پھر ان سے جو اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں ، انھیں شمار کرایا ہے اور کہا ہے کہ :-

" یہ کہنا غلط ہے کہ ایشیائی شاعروں نے اخلاقی مضامین نظم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی ۔ گلستاں اور بوستاں ہی میں جتنے اخلاقی مسائل پیش کیے گئے ہیں ان کا شمار ناممکن ہے ،،

سلسلۂ بیاں کو نیا ربط دے کر آپ نے توارد ، سرقہ ، ترجمہ اور استنباط کے موضوع پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں ، ضرورت ہے کہ ہمارے نو آموز یا نو خیز شعرا انھیں غور سے پڑھیں اور اپنے لیے مشعل راہ بنائیں ۔ اس بحث میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ توارد شعرا کے درمیان ممکن ہے اور وہ عیب نہیں ۔ البتہ خیالات کا سرقہ ہو یا لفظوں کی چوری یہ دونوں چیزیں ادبی دنیا میں بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہیں جتنا قانونی دنیا میں ۔ ہاں غیر زبانوں کے شعروں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے ، مگر خوبی یہ ہے کہ غیر زبان سے کوئی مضمون اگر اخذ کیا جائے تو ترقی کے ساتھ کہ اس سے ادب مالامال ہوتا ہے ۔ لیکن اگر سلیقے اور اہتمام سے ترجمہ نہیں کیا گیا تو وہ ایک حرکت باطل اور فضول محض ہے ۔ دوسرے کے مضامین کو خود سلیقے اور اہتمام کے ساتھ نظم کرنا بجائے خود ایک صنعت ہے ۔ پنڈت جی نے اس صورت کو مستحسن قرار دیا ہے اور مثال میں سعدی کا ایک شعر پیش کیا ہے

ترا ہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت   کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

—— پنڈت جی اس شعر کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ :-

"خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا ہے مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے ۔ عاشق کا محبوب کو یہ مشورہ دینا کہ تم اس شہر کو چھوڑ کو دوسرے شہر میں چلے جاؤ کیونکہ یہاں تمھاری دلبری کے لیے کوئی دل باقی نہیں رہا یہ ایک نازیبا سی بات ہے ۔ لہذا انھوں نے اسی مضمون کو

ترقی دے کر شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

ایک دوسرے ادبی خطبے میں آپ نے نظم و نثر کے موضوع پر گلفشانی کی ہے اور بلیغ نکات پیدا کیے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فصاحت کی تعریف ان لفظوں میں فرمائی ہے کہ :-

"فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں ۔۔۔۔۔۔ مثلاً یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمے کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود فصیح ہے لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے۔ الفاظ کا بھی یہی حال ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اس کے گرد و پیش ایسے متناسب اور موزوں الفاظ جمع کر دیے جائیں کہ وہ آپس میں میل کھا جائیں اور یہ دلیل کمال فصاحت کی ہے"

—— اس کے بعد میر انیس کے بعض مصرعے آپ نے مثال میں پیش کیے ہیں اور اس قابلیت سے ان کی خصوصیاتِ فصاحت کو واضح کیا ہے کہ ہر نکتہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے علاوہ قاآنی کا ایک شعر بھی دلیل میں لائے ہیں ؎

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش ز سیم و زر
ملاطش نافۂ اذفر، حصاتش لولوئے لالا

—— پنڈت جی نے اس شعر کی جو فنی تحلیل کی ہے وہ ان کی ادبی بصیرت کا شاہکار ہے۔ اسی ضمن میں عجمی اور ہندوستانی شعراء کے فارسی کلام کا موازنہ کیا ہے اور بڑی دلچسپ مثالوں سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ عجمی اور ہندوستانی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے مشرا ن مرحوم نے ایک فنی نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ :-

"بعض شاعر صنعتِ سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی وہی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے" باید مطلع از صنعت سجع عاری باشد"، چنانچہ شعرائے فارس نے اس صنعت میں جس قدر قصائد لکھے ہیں

ان میں یہ التزام رکھا ہے لیکن ہندوستانی شعراء اس التزام کو نہیں برتتے اور یہ ان کی غلطی ہے"

پنڈت جی نے اس سلسلے میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے بعد بلاغت کی تعریف نقل کی ہے:-

"صاحبو! بلاغت کی تعریف علماء نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ (بعض نے) بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلاغت کا جزو اعظم ہے بلاغۃُ الکلامِ تطابقُ المقام، یعنی یہ کہ کلام حسب مقام ہو"

——پھر بتلایا ہے کہ آخر علمائے معانی نے بلاغت کی یہ تعریف ناقص قرار دی اور اب بلاغت کا جزء فصاحت بھی قرار پایا۔ لیکن ہارون رشید عباسی کے عہد میں پھر اس تعریف پر اعتراض کیا گیا تھا۔ ہارون کا قول تھا:-

"احسن الکلام ما قلّ و دلّ"

——"اب بلاغت کی تعریف یہ قرار پائی۔ کلام حسب مقام ہو، کلام میں فصاحت ہو اور عبارت ما قلّ و دلّ ہو۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں"

——اس کے بعد پنڈت جی نے بلیغ نثر کی مثالیں پیش کی ہیں اور سالار عساکر عباسیہ طاہر ذوالیمینین کی ایک عبارت نقل کی ہے اور پھر اس عبارت سے جو بلیغ نکات اخذ کیے ہیں، حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

یہی نہیں کہ اصول بلاغت کی تشریح میں آپ نے صرف نثر ہی کے نمونے پیش کیے ہوں بلکہ نظم کی طرف بھی توجہ کی ہے اور مقبلؔ و انیسؔ کے مراثی کے بعض ٹکڑے پیش کیے ہیں کہ نہ صرف موضوع پر مکمل روشنی پڑتی ہے بلکہ کلام میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

پنڈت جی کے خطبات میں بعض وقت افسانہ در افسانہ اور داستان پس داستان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو بہت لطف دیتی ہے اور خطیب کی اصلی شان ہی

یہ ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرے۔ چنانچہ اسی خطبے میں فصاحت و بلاغت کی بحث کرتے کرتے انھوں نے فن انشاد (شعر خوانی) کے اصول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ اُردو ادب کے لیے یہ بحث شاید نئی ہے۔ فن تجوید و قرأت پر ہماری زبان میں اکثر کتابیں لکھی گئیں مگر فن شعر خوانی پر کوئی رسالہ موجود نہیں ہے۔ البتہ مرحوم حامد علی خاں صاحب امروہوی بار۔ ایٹ۔ لا نے اپنے سفر نامۂ انگلستان میں ضمنی طور پر اس فن کا تذکرہ کیا ہے اور انگلستان کے بعض ماہرین فن کے کمالات پر روشنی ڈالی ہے پنڈت جی فرماتے ہیں کہ

"کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا۔ بہر حال میری نظر سے نہیں گزرا اور باوجود تلاش مجھے نہیں ملا۔ میں اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی[1] ہوگا"

اس کے بعد پنڈت جی نے اس فن کے اصول بیان کیے ہیں اور چند شعر بطور مثال پیش کیے ہیں اور ان کی خواندگی اور قرأت کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً

نہال باغ علیّین۔ بہار مرغزار دیں   نسیم روضۂ لیسین۔ شمیم دوحۂ طاہا

اس شعر کی خواندگی کا آپ نے جو طریقہ بتلایا ہے۔ اُسے آپ کے ہی لفظوں میں سُنیے:-

"مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم روضہ اور شمیم دوحہ پر زور دینا چاہیے۔ جب یہ شعر اس طرح پڑھا جائے گا تو شعر کی خوبی دہ چند نہیں ہزار چند ہو جائے گی"

پنڈت جی نے خواندگی شعر کے عیوب ان لفظوں میں بیان کیے ہیں:-

"یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظی کی جگہ مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظی پڑھتے ہیں"

گدائے کہ بر خاطرش بند نیست   بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

۔ "بہ" کی "ہ" ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیے کہ "بہ" کی (ہ) "از" کی (ز) میں مل کر آواز دے اور "از" کا (ا) گر جائے

---

[1] خدا معلوم یہ رسالہ مرتب ہوا یا نہیں بہر حال مرحوم کے کتب خانے میں دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ پنڈت جی کا دوسرا رسالہ فن تذکیر و تانیث ملا ہے۔ اُمید ہے جلد اشاعت پذیر ہو گا۔

یعنی آواز نہ دے - الخ"

اسی طرح پنڈت جی نے قرأت شعر کو متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے اور خصوصیت سے یورپ کے اہل کمال کا ذکر کیا ہے - کہتے ہیں :-

"پروفیسر ہارٹلے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس فن کے ماہر تھے - وہ جب شعر پڑھتے تھے تو خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے - میرے خیال میں ہندوستان میں خدائے سخن میر انیس فن انشاد و خوانندگی کے ماہر و امام تھے"

پنڈت جی ذوق سلیم اور مذاق صحیح کے مالک تھے - جہاں وہ ادبیات اُردو کے محاسن اور خوبیوں کو بتمام و کمال سمجھتے تھے وہاں وہ اس کے نقائص اور اسقام پر نکتہ چینی اور تنقید کرنے میں بھی دلیر تھے - آپ اپنے خطبے میں اُردو شعراء اور ادیبوں کو اس طرح مشورہ دیتے ہیں :-

" اب وہ وقت آگیا ہے کہ نظم اُردو میں نئے نئے مفید اور بکار آمد مضامین دخل پائیں - قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اس کو پستی زوال سے ابھار کر اَوج کمال پر پہنچانے والے جذبات، قوم کی غیرت اور حمیت کی رگ کو حرکت دینے والے مضامین - اور نام و ننگ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والے خیالات اگر نظم اُردو میں داخل کیے جائیں اور اس کے ساتھ آداب شاعری کا برتاؤ پورا پورا کیا جائے تو عام طبائع کے نزدیک پسندیدہ ہو اور ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہو - اگر یہ ترمیم نظم اُردو میں ہو جائے (جو بالفعل ہو رہی ہے) تو پھر اُردو نظم کا مقابلہ دنیا میں کوئی دوسری نظم نہ کر سکے گی "

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ایشیائی ادب میں الفاظ پر زیادہ زور دیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ :-

" ایشیائی نظم کا پہلا اصول زبان سکھانا ہے - آداب و اخلاق کے مضامین، جن کی کمی ہرگز نہیں ہے، ایسے پیرایے میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لوازمات شاعری کا برتاؤ پورا پورا ہو جائے - جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آداب شاعری سکھائے جائیں اور اصناف سخن پر عبور ہو - ردیف و قافیہ کی قید ایسا قافیہ تنگ

کرتی ہے کہ شاعر الفاظ کی تلاش میں حقیقت واقعہ سے دور جا پڑتا ہے ـــــ
انگریزی نظم ہرگز زبان نہیں سکھاتی ۔ نہ اس میں ردیف و قافیہ کی پابندی ہے ۔
اسی وجہ سے اخلاق کا بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہوتا ہے"
ہندوستانی اور فارسی شعراء کی پوزیشن ان لفظوں میں صاف کرتے ہیں کہ :-

"شعرائے ہندو پارس میں بہت شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تغزل میں بھی بیشتر آداب و اخلاق کے مضامین نہایت قابل قدر لکھے ہیں اور سیکڑوں مفید و بکار آمد مضمون باندھے ہیں ۔ اور باایں ہمہ صفت شاعری کا پورا پورا برتاؤ کیا ہے"

اس کے بعد اسیر لکھنوی کے بہت سے شعر بطور استناد پیش کیے ہیں اور اپنے نظریے کو بدلائل واضحہ ثابت کیا ہے ۔

مختصر یہ کہ پنڈت جی کا ادبی نظریہ ، ان کی جامعیت تنقیدی ، ان کی استعداد علمی اور ذوق کے شایان شان ہے ۔ ان کے خطبات ، لطیف ادبی نکتوں سے معمور ہیں ۔ سب سے بڑی خوبی ان کی قوت تمثیل ہے ۔ چونکہ ان کا تاریخی مطالعہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا اس لیے وہ جس نکتے کو بیان کرتے تھے اس کے ثبوت میں صدہا تاریخی حکایات اور متقدمین کے اقوال نقل کر دیتے تھے ۔ وہ عربی ، فارسی اور مغربی ادبیات سے کماحقہ آگاہ تھے اور اس منطقی ترتیب سے اپنے دلائل پیش کرتے تھے کہ قبول کر لینے کے سوا چارہ نہ تھا ۔ ـــــ یہ سب کیا تھا ؟ ۔ درحقیقت یہ کرشمہ تھا اُس ماحول کا جس میں ہمارے علم دوست ہیرو نے آنکھیں کھولی تھیں ۔ وہ ماحول جس میں ، ہنود ، اسلامی علوم ، کمال رغبت سے حاصل کرتے تھے اور مسلمان ہندو ادبیات اور ہندو روایات سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے ۔ دونوں کی رسوم مشترک تھیں ۔ دونوں کا فلسفہ مشترک تھا ۔ من و تو کا امتیاز مٹ گیا تھا اور کامل اتحاد و اتفاق کا دَور دَورہ تھا اور اُردو اس وحدت کاملہ کا مظہر تھی جس کے متعلق پنڈت جی نے کہا ہے کہ :-

"اُردو مصلح قوم اکبر اعظم کا عطیہ اور ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے"

ہم بیان کر چکے ہیں کہ پنڈت جی کا مجموعۂ خطبات ۱۵ خطبوں پر مشتمل ہے ۔ جس میں ادبی خطبات تین ہیں ۔ ادبی خطبات پر ہم ایک سرسری نظر گزشتہ سطور میں ڈال چکے ہیں ۔

بقیہ خطبات میں چار خطبے خالص اسلامی مباحث پر ہیں۔ سیرۃ النبیؐ، عید قرباں، علمائے اسلام کا شکریہ اور مصطفےٰ کمال کی فتح ——— ہم ان خطبات پر آیندہ سطور میں روشنی ڈالیں گے۔ اسلامی خطبات کے علاوہ مذہبی رنگ کے چند خطبات اور ہیں۔ ان میں سے دو خطبے تھیا سوفی کے موضوع پر دو خطبے مسیحیت کے متعلق اور بقیہ راماین اور دسہرے وغیرہ کے موضوع پر دیے گئے تھے۔ تھیا سوفی کے موضوع پر پنڈت جی نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دلی خیالات کا عکس ہے کیونکہ تھیا سوفی (ویدانت یا تصوف) سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ ان کی زندگی کا نصب العین ایک شعر تھا ؎

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن — آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اور تھیا سوفی ازم، صلح کل کا علمبردار ہے۔ لہذا پنڈت جی کو تھیا سوفی ازم سے دلچسپی لینا ناگزیر تھا۔ اسلامی موضوعات پر پنڈت جی نے جو کچھ فرمایا ہے شاید ہی کوئی اسلامی خطیب اس پر کچھ اضافہ کر سکے۔ ہم نے مقدمے کی ابتدا میں ژان ژاک روسو کا ایک مقولہ نقل کیا تھا۔

"ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے الخ"

——— آپ خطبات مشران کو اس مقولے کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ ان کے حرف حرف کو پڑھ جائیے۔ آپ کو حقیر ترین تعصبات کی گندگی اور امتیازات آئین و ملت کی آلودگی کہیں نظر نہ آئے گی۔ وہ یقیناً اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے کہ:-

"اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو نہ کہیں مذہب کے نام پر لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لیے خانہ جنگیاں"

——— واقعہ یہ ہے کہ پنڈت جی کا مذہب انسانیت اور عقیدہ بین الاقوامیت تھا۔ اس کا صحیح اندازہ ان کے اسلامی خطبات سے ہو سکتا ہے۔ موصوف یوم میلاد النبیؐ کے خطبے کا آغاز ان لفظوں سے فرماتے ہیں کہ:-

"صاحبان ذیشان! آج کا روز دلفروز خود نوروز ہے اور یہ روزِ سعید بجائے خود یوم عید ہے۔ ہندو مسلم بھائیو! جناب پیغمبرؐ صاحب کے اوصاف حمیدہ

اور اخلاق پسندیدہ کا احصاء کرنا اس ضیق وقت میں محال بلکہ لاطائل خیال ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کریں کیا مجال ہے۔ لہذا بطور مشتے از خروارے اور قطرہ از دریا بارے عرض کروں گا "

——— اور پھر اس مرصع تمہید کے بعد بطور مشتے از خروارے آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ کہیں سیرۃ رسولؐ پر فلسفیانہ حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ کہیں جذبات عقیدت سے مجبور ہو کر نغمۂ نعت چھیڑ دیا ہے۔ کہیں تاریخی تبصرہ ہے تو کہیں اخلاقی نقطۂ نظر۔ الغرض یہ خطبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہ اس بہترین لٹریچر میں شامل کرنے کے قابل ہے جو سیرۃ نگاروں نے سیرت رسولؐ پر دنیا کی کسی زبان میں مرتب کیا ہے۔

پنڈت جی اسلامیات کے بہترین عالم تھے اور آپ اسلامی تاریخ کے جزو وکُل سے باخبر تھے۔ ادبی خطبات میں کلام انیس پر بحث کرتے کرتے آپ نے واقعۂ کربلا کی جن تلمیحات کو بے نقاب کیا ہے وہ آپ کی وسعت نظر کا ثبوت ہے۔ آپ اپنے خطبات میں جابجا تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور نمایاں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ضروری نکات کی تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ خطبات موسیقی میں، اسحاق موصلی، عریب (مغنیہ) ہارون رشید اور معتز باللہ کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور عہدِ عباسیہ میں فن موسیقی کی جو قدر و منزلت تھی اُسے سراہا ہے۔ ادبی خطبات میں عربی شعراء کے اثر و نفوذ پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ علمائے اسلام پر جو خطبہ دیا ہے وہ اہم تاریخی معلومات سے لبریز ہے۔ آپ نے اپنے خطبوں میں —— حجاج بغدادی، ابو حاتم رازی، ابو العلاء ہمدانی، ابو نصر فارابی، ابو العباس رازی، ابو البرکات، ابو الحسن طبیب، ابو بکر بن بشار اور عبداللہ اصفہانی کی شخصیتوں اور ان کی مصنفات کا سیر حاصل تذکرہ کیا ہے اور علمائے اسلام کی ادبی، طبی اور تحقیقی خدمات کی داد دی ہے۔

یہ کہنا کہ آپ عربی کے علامۂ اجل تھے، آپ کے کمالات علمی کے اظہار میں بخل کرنا ہے کیونکہ اس مجموعے کا ناظر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان پر آپ کو اسی قدر عبور حاصل تھا جتنا کہ کسی خالص ولایتی (عجم نژاد) کو ہو سکتا ہے۔ آپ ادبیات فارسی کی اُن فنی خوبیوں سے واقف تھے جن تک بہت کم نگاہیں پہونچتی ہیں۔

اس کا اندازہ ناممکن ہے کہ آپ کو اساتذۂ عرب و عجم کے کتنے منتخب اشعار حفظ تھے۔ نثر میں برمحل نظم کا استعمال کرنا بھی ایک فن ہے اور سپرو مرحوم بلاشبہ اس فن کے مجتہد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی شعراء میں فردوسی، سعدی اور میرزا حبیب قاآنی ان کے محبوب شاعر تھے اور اسی چیز سے ان کی سلامتی طبع اور صحت مذاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں تک موصوف کے جن خطبوں کا ذکر ہوا ان کے علاوہ بقیہ خطبات گو کہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے مختلف اور رنگ رنگ ہیں لیکن زبان و بیان کی پاکیزگی، روانی اور سلاست و فصاحت کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ پنڈت جی کی زبان میں بلا کا لوچ ہے، غضب کی آمد ہے۔ وہ کہیں محاورہ بندی اور روزمرہ کا کمال دکھلاتے ہیں اور کہیں مسجع عبارت لکھتے ہیں۔ دونوں جگہ زبان کی گھلاوٹ اور قدرت کلام مزہ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر ان کے خطبات کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کیے جائیں تو بحث کا دامن بہت وسیع ہو جائے گا اور وقت کی کمی اور فرصت کا اختصار اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ ان کا ہر خطبہ اپنی جداگانہ ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بیش بہا علمی مواد کے لحاظ سے اپنے مطالعے کی خاموش سفارش ہے بلکہ اپنے حسن ادا اور زبان و بیاں کے اعتبار سے بھی اپنی دلچسپی کی منہ بولتی شہادت ہے۔

تاریخی خطبات جو جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے موضوع کی عظمت کے لحاظ سے ہماری خاص توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے، مگر ہم اس وقت صرف ان کا خاکہ پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے تاکہ نکتہ رس ماہرینِ فنِ تاریخ اس خاکے کو پڑھ کر اندازہ کر لیں کہ مضمون نگار نے اس موضوع کے کسی بھی دقیق اور اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ پنڈت جی اپنی پبلک زندگی کی ابتدا میں ایک اعتدال پسند اور محتاط شخص تھے چنانچہ ان خطبات میں حرف حرف سے آپ کی معتدل و محتاط سیاست دانی کا پتہ چلتا ہے اور مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ قائل کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہو۔ اس زمانے میں ہندوستانی سیاست جس نقطے پر تھی اس کے لحاظ سے لبرل ازم ہی مناسب تھا۔ ہر سہ خطبات کا

مجموعی خاکہ یہ ہے۔

اوّل آپ نے جنگ عظیم کے تاریخی اسباب اور متحارب فریقین کے سیاسی روابط پر قیمتی روشنی ڈالی ہے، پھر سرویا، روس، آسٹریا، جرمن اور فرانس کے باہمی تعلقات، یورپ کی گزشتہ تاریخ، ریاستہائے بلقان کی سیاسی حالت، اور جنگ عظیم کے اسبابِ ظہور پر عالمانہ بحث کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح سرویا اور آسٹریا کی رقابت نے دول یورپ کو زندگی اور موت کی جدو جہد میں مبتلا کر دیا۔ ضمناً برطانیہ کی معدلت گستری اور انصاف پسندی کا شاندار لفظوں میں قصیدہ بھی پڑھا ہے۔

—— پھر اتحادیوں کی اخلاقی برتری اور آسٹریا اور جرمن کی وحشیانہ حرکات کا مہیب افسانہ بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ آخری فتح کا دار و مدار گاڈزوری یعنی مادی طاقت کے بیدردانہ استعمال پر نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی طاقت پر ہوتا ہے۔

آگے چل کر اتحادی فوجوں کی شاندار کامیابیوں کی تفصیل پیش کی ہے اور ترکی کی شرکت جنگ کو اسلامی مفاد کے لیے مضر بتایا ہے۔ ترکی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جی نے ترکی کی جرمن نوازی کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان کی سچائی صرف آج کا مؤرخ ہی جان سکتا ہے جبکہ اس لڑائی کی ہر تفصیل منظر عام پر آ چکی ہے۔ اسی خطبے میں آپ نے ہندوستانیوں کی امداد جنگ کا تذکرہ کیا ہے اور بلجیم میں جرمن مظالم کی خوفناک روداد سنائی ہے۔

—— آسٹریا، سرویا اور روس کی لڑائیوں کا تذکرہ کر کے ایک پختہ کار جنگی مبصر کی طرح محاذ جنگ کی مکمل ڈائری پیش کی ہے۔

—— لکسمبرگ کے تاریخی حالات، بلجیم کی مختصر تاریخ اور دول یورپ کے باہمی عہد ناموں کا ذکر کیا ہے اور ان تمام جزئیات کو بیان کر دیا ہے جو لیج، اینٹورپ اور بلجیم کے دوسرے جنگی مورچوں پر فوجی نقل و حرکت کے سلسلے میں پیش آئیں۔ یہ تمام تفصیلات تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔

—— اس سلسلے کا آخری خطبہ وہ ہے جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں آپ نے یوم فتح کے موقع پر ٹاؤن ہال (فرخ آباد) کے ایک جلسۂ تہنیت میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبے میں آپ نے ہندوستانی خدمات کو

ان لفظوں میں گنایا ہے کہ :-

"ہمارے مُلک ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس نے اس جنگِ عظیم میں کافی حصّہ لیا - اس کی فوجوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کی فوجوں کے سامنے بہادریاں دکھائیں اور دادِ شجاعت دی"

اس کے بعد آپ نے برطانوی مدبّرین کے وہ پیغام نقل کیے ہیں جو انھوں نے ہندوستانیوں کی امدادِ جنگ کے شکریے میں حکومتِ ہند کو ارسال کیے تھے اور اس چیز پر خوشی ظاہر کی تھی کہ بین الاقوامی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو بھی اپنی نمائندگی کے لیے سر ایس، پی، سنہا کو بھیجنے کا استحقاق دیا گیا ہے -

اس تقریر کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے :-

"یا الٰہی! تو نے ہمارے وطنِ مالوف کو اس لڑائی کی آگ سے محفوظ رکھا اور اس موقع پر تو نے ہم کو برٹش قوم کے سایۂ عاطفت میں پناہ دی جس کی بدولت تمام دنیا کی تہذیب و آزادی برقرار رہی - یا الٰہی تو سالہا سال ہمارے شہنشاہِ معظم کو تختِ برطانیہ پر حکمراں اور تندرست و خوش و خرّم رکھ!"

ان خطبات سے پنڈت جی کی سیاسی زندگی کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے - غالباً اس چیز کے دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس زمانے میں مشران مرحوم نے یہ خیال ظاہر کیے تھے اُس وقت ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر اس سے زیادہ کچھ کہنے کا عادی نہ تھا - انتہا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی بھی (جنھیں وائٹ ہال نے ۱۹۳۱ء میں باغی فقیر کا خطاب دیا تھا) گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر انہی لوگوں کی صف میں تھے جو مساعیِ جنگ سے کامل تعاون کر رہے تھے - لیکن جب لڑائی ۱۹۱۸ء میں حکومتِ برطانیہ کی عظیم الشان فتح پر ختم ہوئی اور وہ اُمید پوری ہونے کا وقت آیا جو دورانِ جنگ میں ہندوستان کی سیاسی اصلاحات اور حقوق کے متعلق اہلِ ہندوستان کیے بیٹھے تھے تو صورتِ حال پلٹ گئی - ایتلافِ ثلاثہ کی شکست اور ترکی کے زوال سے مشرقِ وسطیٰ میں نیا سیاسی نظام قائم ہوا، جس سے مسلمانانِ ہند کو سخت اندیشے پیدا ہو گئے - اُدھر عام ہندوستانیوں نے یہ محسوس کیا کہ مساعیِ جنگ کا انعام

انھیں نا امیدی، مایوسی اور حرماں نصیبی کی شکل میں ملا ہے تو ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک بے اطمینانی، بے اعتمادی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ اُس شاندار تحریک کی شکل میں نکلا جسے ہم خلافت ایجی ٹیشن کہہ کر پکارتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ قومی حادثہ تھا جس نے ہندوستان کے سیاسی خیالات کے دھارے کو بدل دیا۔ مہاتما گاندھی نے ملک کو لاتعاون کا حربہ دیا اور ہندو مسلمان کے کامل اتحاد نے ہمارے قومی شعور کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

پنڈت جی ایک سچّے قوم پرست اور پکّے وطن دوست تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ ان ہنگاموں سے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات نہ پڑتے۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مہاتما گاندھی کے یوم پیدایش (جنم دن) پر جو خطبہ دیا ہے اور اس میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو خاتمۂ جنگ پر برطانی شہنشاہیّت کا دُعاگو اور قصیدہ خواں تھا۔ مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک یعنی تین سال کی مختصر مدّت میں ہندوستان کا سیاسی قافلہ کہیں سے کہیں جا پہونچا تھا اور پچھلے دَور کے ماڈریٹ، عہدِ نَو کے سب سے بڑے انقلابی بن گئے تھے ؎

طے میشود ایں رہ بدرخشیدن برقے　　　ما بیخبراں منتظر شمع و چراغیم

گاندھی جی کے جنم دن پر پنڈت جی نے جو خطبہ دیا ہے، اس میں پہلے ان کے خاندانی حالات بیان کیے ہیں اور پھر خود ان کے ابتدائی حالات کا تذکرہ کر کے ان کی وفائے عہد، سچائی اور دیانت کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کے اُن حوادث کا خاکہ پیش کیا ہے جنھوں نے گاندھی جی کو ستیّاگرہی بنایا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو مظالم ہوئے تھے ان کی طرف اشارے کیے ہیں اور ٹرانسوال میں گاندھی جی نے ہندوستانی آبادکاروں کے تحفظ حقوق کے لیے جو مہم شروع کی تھی اس پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی اس امداد کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے دَوران جنگ میں حکومت کو پیشکش کی۔ ان کے اپنے الفاظ میں:-

"جب یورپ کی جنگ چھڑی، اس وقت مہاتما گاندھی نے رنگروٹ بھرتی

کرانے میں بڑی مدد حکومت برطانیہ کو دی اور تمام ملک کو یہی ہدایت کرتے رہے۔
چنانچہ ۲۲ لاکھ ہندوستانیوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہا کر برطانیہ کے لیے
فتح حاصل کی۔ لیکن جب مہاتما جی نے دیکھا کہ فتح کے بعد بھی ہندوستان کو
مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکی بلکہ ڈومینین اسٹیٹس (یعنی درجہ نو آبادیات)
بھی نصیب نہیں ہوا اور ہم ع

پھر آ گئے اُسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

کا سراسر مصداق ہو کر رہ گئے تب مہاتما جی نے نہایت مایوس ہو کر ترک موالات
کی تحریک شروع کی "۔

—— ہم نے قصداً ان کے خطبے کا مذکورۂ بالا اقتباس پیش کیا ہے کیونکہ اگرچہ اس عبارت میں انھوں نے گاندھی جی کے زاویۂ نظر کی تبدیلی کے اسباب واضح کیے ہیں، مگر ان لفظوں میں ہم خود ان کے سیاسی خیالات کے محرکاتِ تغیر و انقلاب کو کارفرما پا رہے ہیں۔

—— اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کے اخلاقی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کے فلسفۂ عدم تشدد اور نظریۂ لاتعاون کی تفسیر کی ہے۔

پنڈت جی کا دوسرا سیاسی خطبہ وہ ہے جو آپ نے فرخ آباد میں پنڈت موتی لال کی تقریب خیر مقدم میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبے کا آغاز آپ نے تلک کے ایک مقولے سے کیا ہے۔

" سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے ضرور حاصل کروں گا "

—— اس کے بعد آپ نے پنڈت موتی لال کے ایثار و قربانی کا تذکرہ کیا ہے اور تحریک لاتعاون سے پنڈت جی کی زندگی میں جو انقلاب آ گیا تھا اس کو اس شعر سے ظاہر کیا ہے کہ ؎

ادراک حال ما ز نگہ می تواں نمود — حرفے ز حال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

—— پھر ہنٹر کمیشن کی تحقیقات کے سلسلے میں آنجہانی پنڈت موتی لال نے جو قربانیاں کی تھیں ان کی داد دی ہے اور قوم کو اس عظیم المرتبت انسان کے نقش قدم پہ چلنے کی ہدایت

کی ہے - مشران مرحوم کے سیاسی خطبات کی پہلی کڑی وہ تقریر ہے جو آپ نے نومبر ۱۹۱۳ء میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن (اسپیکر یو پی اسمبلی) کے مکان پر جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تکالیف کے موضوع پر کی تھی - اس خطبے میں اگرچہ جذبات کی وہ تلخی نہیں ہے جو قدرۃً اس کے بعد عام ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئی تھی لیکن خیالات میں انقلابی رنگ جھلک رہا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ پنڈت جی شروع ہی سے خالص قوم پرست اور نڈر طبیعت کے مالک تھے -

اس خطبے میں انھوں نے گاندھی جی کی اُس تحریک کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی آبادکاروں کے حقوق و مطالبات کے حصول کے لیے شروع کی تھی اور پھر حکومت افریقہ کے مظالم کو بیان کیا ہے - ضمنی طور پر انھوں نے حکومت برطانیہ کی توجہ ملکۂ وکٹوریہ کے "میگنا چارٹا" (منشور آزادی) کی طرف مبذول کرائی ہے اور سختی کے ساتھ اُن قوانین کے خلاف احتجاج کیا ہے جو حکومت افریقہ نے ہندوستانیوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے بنائے تھے -

بہرحال پنڈت جی کے سیاسی خطبات سے ان کے قومی شعور کے درجہ بدرجہ ارتقاء کا بخوبی پتہ چلتا ہے - شروع میں وہ لبرل عقائد رکھتے تھے، لیکن حالات نے آخر میں انھیں انتہا پسندوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور ان کی زندگی اس شعر کی عملی تفسیر بن گئی ؎

وفا کیسی - کہاں کا عشق - جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

اب ہم خطباتِ مشران کا وہ اہم ترین وصف منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں جو نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ حسن فطرت کے نبّاضوں کی نگاہ میں بھی جملہ خصوصیات کلام سے زیادہ مدح و ثنا کا مستحق ہے - کسی خطیب کے خطبات (یا شاعر کے کلام) پر نقد و نظر کرنے میں سب سے عجیب اور دلکش نکتہ جس پر خطبے یا کلام کے مقبول یا غیر مقبول و مردود ہونے کا انحصار ہے، وہ ہے جو اہل بلاغت کی اصطلاح میں "مقتضائے حال کی مطابقت" سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر علم النفس کے ماہرین اس کو "نفسیاتی مصوری" کے نام سے موسوم

کرتے ہیں۔ ہم اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے اپنے مقالے کا ایک جزو مزید توضیح وتشریح کے ساتھ دوہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس کو سامنے رکھ کر ہم اپنے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ واضح کرسکیں گے۔ اس مقالے کی ابتدا میں کہا جاچکا ہے کہ اگرچہ اظہارِ خیال و بیانِ مطالب کے اعتبار سے شاعر، مصنّف اور خطیب بظاہر ایک ہی صف میں آتے ہیں مگر شعرا و مصنفین، اظہارِ خیال و بیانِ مطالب کے وقت صرف اپنے نفس سے مخاطب ہوتے ہیں، ان کے روبرو کوئی مجمع نہیں ہوتا اور نہ اُن کو عوام کے نفسیات کا چنداں لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ لا محدود وقت اور بے پایاں فرصت کے مالک ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ایک لفظ کی تہذیب و اصلاح پر وہ ایک ایک دن صرف کردیں یا ایک مطلب کو واضح کرنے کے لیے ہزاروں صفحات استعمال کرڈالیں۔ شعرا اپنے موضوعِ نظم اور مصنفین اپنے نقطۂ بیان کے سلسلے میں بالکل آزاد ہوتے ہیں، مگر خطیب کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ شاعر اور مصنّف کا مقام خلوت و عزلت ہے اور خطیب و مقرر کی جگہ محفل و جلوت۔ خلوت و عزلت میں انسان کے ضمیر، خیال، اور قلم پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا لیکن ہنگامۂ محفل اور گرمیِ جلوت کے وقت زبان کھولنا، مطالب کی دلنشینی برقرار رکھنا، محدود وقت کا بہترین استعمال کرنا، حاضرین کو درمیان میں جگہ جگہ تروتازہ کردینا، تقریر کی روانی میں، بیان کے بے کیف تعطل کو پاس نہ آنے دینا، موضوع پر قائم رہتے ہوئے مختلف مطالب سے ایسے نتائج استخراج کرنا جو موضوعِ بحث کو اور زیادہ قوت دیں، سننے والوں کو اُکتانے نہ دینا، بیان کے دوران میں جا بجا ظرافت کا رنگ پیدا کرنا، دلچسپ نکات و لطائف سے اپنے کلام کو رنگین و جاذب بنانا، اثنائے کلام میں موزوں اشعار و اقوال کی چُست بندش کرنا، حاضرین کے خیالات و احساسات کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر رہنا، تقریر کے اجزا و عناصر کو منطقی مہارت سے جُدا جُدا کرنا اور پھر ہر جزو کی خصوصیات واضح کرنا، اُن سے نتیجہ نکالنا، ان کے باہمی روابط کو روشنی میں لانا، پھر ان منزلوں سے گزر کر اپنے موضوع کو ہاتھ لگانا اور سننے والوں کی کامل دماغی تائید حاصل کرنا، یہ ہیں ایک خطیب کے فرائض، جنھیں وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں میں بیک وقت انجام دیتا ہے۔ گو کہ

ایک مصنف بھی اپنی تصنیف کو انہی چیزوں سے سنوارتا ہے اور ایک شاعر بھی اپنی نظم میں قریب قریب انہی قواعد کی پیروی کرتا ہے، لیکن وہی فرق، کہ شاعر و مصنف ایک نظم یا ایک مقالے کی ترتیب و تکمیل کے وقت کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔ وہ اگر اپنی پوری عمر صرف ایک موضوع پر گزار دیں، جب بھی ان پر کوئی معترض نہیں ہو سکتا —— لیکن خطیب کو یہ سہولت کہاں نصیب۔ ایک خطیب اپنی تقریر میں کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے یا اسے کن کن قواعد کی پیروی کرنا پڑتی ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے علمائے منطق و کلام نے تقریر کو حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ تمہید۔ یعنی تقریر کا وہ ابتدائی حصہ جس میں وہ اپنے موضوع کی مبادیات واضح کرتا ہے اور حاضرین کو آیندہ تقریر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اس حصے میں دلائل و براہین کی بھرمار نہیں ہوتی بلکہ ابتدا ہوتی ہے۔ خطیب سادہ لفظوں میں اپنے موضوع کلام کا تعارف کراتا ہے اور ان ضروریات کو واضح کرتا ہے جن کی بنا پر اس نے حاضرین کو اپنے گرد و پیش مجتمع کیا ہے۔ اکثر خطیب خطبے کی ابتدا میں اپنی ہیچمدانی اور ژولیدہ بیانی کا اعتراف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگے چل کر تقریر میں کوئی خامی پیدا ہو جائے تو خطیب کا عجز و انکسار ان نقائص کا کفارہ بن کر سامعین کے تنغص کو دور کر دے۔ اس ہیچمدانی اور خاکساری کے ساتھ موضوع کی اہمیت و عظمت کا بھی پُرتاثیر لفظوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ سننے والوں کے دل میں مُقرّر کے لیے جذبۂ ہمدردی اور موضوع کے لیے جذبۂ عظمت پیدا ہو جائے اور ان پر استعجاب و اشتیاق کی کیفیت طاری ہو جائے۔ زور بیان، طلاقت زبان اور جوہر ادا کے کمالات دکھلاتا ہے تاکہ یہ استعجاب و اشتیاق برابر بڑھتا رہے۔ ایک مُقرّر کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دَوران کلام میں برابر اپنے سامعین کے جذبات شوق و حیرت میں اضافہ کرتا رہے تا اینکہ تقریر ختم ہو جائے اور نہ ان کا شعلۂ اشتیاق فرو ہو اور نہ حیرت و تعجب میں کمی آئے۔

۲۔ تمہید کے بعد گریز شروع ہوتی ہے۔ یعنی رجوع الی الموضوع۔ تقریر کا سب سے نازک اور اہم حصہ یہی ہے۔ خطیب کس طرح گریز کرتا ہے اور کس عمدگی اور بے ساختگی سے اپنے

موضوع تک پہونچتا ہے ، یہ تقریر اور خطبے کا ایک معرکۃ الآرا جزو ہے ، جو آہستہ آہستہ کلام کو اپنے عروج و ارتقا تک پہونچا کر، حسنِ بیان کو دلائل و براہین سے مرصع کر دیتا ہے۔ جوں جوں تقریر اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی جاتی ہے ، مُقرِر کے کلام میں جوش و خروش اور سامعین کے قلوب میں ذوق و شوق کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ تقریر کا یہی حصّہ جانِ خطابت کہلاتا ہے۔ کسی خطیب کے کمالِ فن کو جانچنے کا ایک بہتر طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی گریز کی لطافت اور رجوع الی الموضوع کی نزاکت کو دیکھا جائے۔

۳۔ خاتمہ ۔ ماہرینِ فن کا اتفاق ہے کہ کلام کی ابتدا جتنی شاندار ہوگی، اس کا مرکزی یا عروجی نقطہ، اتنا ہی دلچسپ اور جاذب، توجہ ہوگا اور خاتمۂ کلام میں بھی وہ زور اور اثر پیدا ہو جائے گا کہ تقریر کے بعد بھی سامعین ، لطافت، کلام سے سیر نہ ہوں گے۔ خاتمۂ کلام پر تمام دلائل و براہین سمٹ کر کسی ایک نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں اور موضوع واضح ہو جاتا ہے ، لیکن اس موقع پر کمالِ خطابت یہ ہے کہ پایانِ تقریر میں اضمحلالی کیفیت اور افسردگی نہ پیدا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقریر کے آخری مراحل میں نہ صرف یہ کہ سننے والے اُکتا جاتے ہیں بلکہ بولنے والا بھی تھک جاتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا ، اس لیے جلدی جلدی نقطۂ آخر تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عجلت، و سراسیگی کے عالم میں بسا اوقات پوری تقریر بے لوچ ہو کر پھیکی پڑ جاتی ہے اور آغاز تقریر نیز وسطِ تقریر کا تمام اثر و کیف مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

اپنے ہیرو کی نفسیاتی نباضی کا کمال ظاہر کرنے کے لیے سطورِ بالا میں تمہیداً جو کچھ لکھا گیا، اس کے ساتھ یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح مختلف مضامین کے لیے شاعر یا مصنف جداگانہ نوعیتوں کے اسلوب اور الگ الگ قسم کے محاورات و الفاظ انتخاب کرتا ہے ، غزل کے الفاظ اور محاورات ، نازک ، نرم ، سبک اور لچکیلے ہوتے ہیں ، قصائد میں شکوہِ الفاظ اور عظمتِ تراکیب کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے ، مرثیے کے لیے پُر سوز الفاظ اور مانوس الحس محاورے استعمال کیے جاتے ہیں یا افسانوں کی زبان جداگانہ ہوتی ہے ، تاریخی و علمی مضامین کا اسلوب کچھ اور ہوتا ہے ، عورتوں اور بچوں کے لیے جو لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اُس کی بولی اور طرزِ بیان

بھی مختلف ہوتا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جس فن پر قلم اُٹھایا جائے اُسی کی مناسبات اور اصطلاحات استعمال کی جائیں، فن بلاغت کے یہ اصولی لوازم ہیں، جن سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح خطیب کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے لب کشائی کرے۔ جس فن پر وہ بحث کر رہا ہے اسی کے مناسبات و اصطلاحات سے، براعۃ الاستہلال و ایہام کے طور پر اپنے کلام کو سجائے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے مذاق اور معیار ذوق کو بھی پیش نظر رکھے۔ بزم میں فقط اہل نظر ہی نہیں ہوتے۔ تماشائی بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ اہل نظر کی اقلیت ہوتی ہے اور تماشائیوں کی اکثریت۔ کمال خطابت یہ ہے کہ مُقرِّر دونوں کے مذاق کی تسکین کر سکے۔ مسئلہ زیرِ بحث کتنا ہی دقیق و پیچیدہ کیوں نہ ہو، طرزِ ادا اس درجہ سلیس، رواں، برجستہ اور دلچسپ ہونا چاہیے کہ عوام و خواص دونوں اس سے یکساں لطف اٹھائیں۔ آئیے اب متذکرہ فنی اصول اور نفسی رجحانات کی روشنی میں خطباتِ شرران پر ایک نظر ڈالیں۔

جنوری سنہ ۱۹۳۲ء میں موصوف نے آل انڈیا موسیقی کانفرنس کی صدارت کے سلسلے میں جو خطبات ارشاد فرمائے تھے ان کے مطالعے سے ہمارا مقصد بخوبی واضح ہوجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم، عوام کی نفسیات کو سمجھ کر اپنے موضوع کو شگفتہ و پربہار بنانے کا کس قدر ملکہ رکھتے تھے۔ خطبۂ موسیقی کی ابتدا ایک رنگین نظم سے ہوتی ہے۔ موسیقی کو نظم سے فطرۃً جو لگاؤ ہے اس کے لحاظ سے یہ ابتدا کس قدر برمحل اور موزوں ہے۔ اس نظم کے چند شعر پڑھ کر دیکھیے اور غور کیجیے کہ موضوع موسیقی کی تمہید کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور کہاں مل سکتے ہیں ؎

وہ بہار آئی۔ نَوا سنج ہیں مرغانِ چمن — غیرتِ باغِ اِرم آج ہے صحنِ گلشن
جوش میں زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار — کیا تعجب ہے کہ گویا ہو زبانِ سوسن
آبِ شبنم سے کہاں کاسۂ گُل ہیں لبریز — جلترنگ آج بجانے کو ہے معشوقِ چمن

—— انصاف کیجیے کہ فن موسیقی سے تعلق رکھنے والے خطبے کی ابتدا میں ایک مترنم نظم کے ذریعے، مرغانِ چمن کی نوا سنجی، طیور بہار کی زمزمہ سرائی، زبان سوسن کی گویائی اور

معشوقِ چمن کے جلترنگ بجانے کا ذکر، کس قدر برمحل اور دلچسپ ہے اور سامعین کے احساسات نغمہ کو کس نزاکت اور لطافت سے بیدار کیا جارہا ہے تاکہ وہ آیندہ موضوعِ تقریر سے پوری پوری دلچسپی لینے کے لیے مُقرّر کے دمساز اور گوش اور برآواز ہوجائیں۔

—— اس کے بعد موصوف نے انسانی حواس کی لذت پذیری کے خواص کو واضح کیا ہے اور بتلایا ہے کہ حُسن صورت اور حُسن صوت (جنتِ نظارہ اور فردوسِ گوش) کے اثرات دل ودماغ پر کیا ہوتے ہیں۔ پھر حُسنِ نغمہ وصوت کو رعنائیِ شکل وصورت پر ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حُسنِ ظاہر سے حظ نفسانی اور حُسنِ صوت سے لذت روحانی حاصل ہوتی ہے"

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سند کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے ؎

بہ از روئے زیباست آوازِ خوش — کہ آں حظ نفس است وایں قوتِ روح

—— اس کے بعد نہایت رنگین ودلآویز پیرایے میں حسن صورت کے ساتھ خوش گلوئی اور خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فن موسیقی وکمال رقص کو حُسنِ ظاہر کی دلکشی اور دلربائی کا نقطۂ عروج وکمال بتلایا ہے، جو حقیقت اور رجحان نفس دونوں کے لحاظ سے مسلم الثبوت اور ناقابل تردید ہے۔

ہم نے کمالات خطابت کی وضاحت کے سلسلے میں اس چیز پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ عوام کے جذبات اور ان کے نفسیات کو تاریخی لطائف وظرائف اور اقوال مشاہیر سے اُبھار کر تقریر کی کامیابی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا، خطابت کی کامیابی کے لیے کس درجہ ضروری ہے۔ مُشران مرحوم اس گُر سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ آپ اُن کے ہر خطبے میں، خطابیات کا یہ فنی کمال پوری طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اسی خطبے میں حُسنِ صوت، خوش آوازی اور فن رقص کے امتزاج کی لطافتیں بیان کرتے ہوئے رامائن کی ایک روایت کو بطور مثال پیش فرماتے ہیں اور وہ نثر میں نہیں، نظم میں ؎

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ — زباں پر تھا قیامت کا ترانہ

لباس پُر تکلف تن میں پہنے | تنِ گلرنگ میں پھولوں کے گہنے
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں | بہار آئی ہر اک نخل کہن میں
یہ بھولے اپنی درویشی کا لٹکا | تصور بندھ گیا ناگن سی لٹ، کا

—— یہ وہ موقع ہے جب مہاراجا دسرتھ نے اپنے دربار کی ایک اپسرا کو شنگی رکھ کے لانے کے لیے بن میں بھیجا ہے۔ شنگی رکھ ایک مشہور سادھو تھے۔ اُپسرا نے اپنے حسُن و جمال کے افسوں اور رقص و موسیقی کے جادو سے شنگی رکھ کو تسخیر کر لیا۔ مُشران مرحوم نے اس واقعے کو حسُن و موسیقی کے بے پناہ کمالات کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جو شعر سُنائے ہیں وہ منشی شنکر دیال صاحب فرحت کی منظوم راماین کا ایک ٹکڑا ہیں۔

—— اس کے بعد مُشران مرحوم نے خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بجائے خود فن موسیقی ساز و بربط کی قید سے آزاد ہے۔ اگرچہ چنگ و رباب کی ہمسازی سے اس کا اثر ضرور بڑھ جاتا ہے مگر موسیقی اور ساز و مزامیر لازم و ملزوم نہیں، بایں ہمہ مزامیر کے بغیر نغمے میں محویت کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی۔ موصوف اس بحث میں فرماتے ہیں:-

"گانے کے ساتھ طبلے کی تھاپ، بائیں کی گمک، مجیروں اور گھونگھروؤں کی جھنکار ضرور ہونا چاہیے۔ گانے کے ساتھ ساز بھی ہوں تو بعض وقت لے بندھ جاتی ہے اور لطف نغمہ دوبالا ہو جاتا ہے۔"

—— اس کے بعد موصوف نے ایک ماہر فن کی طرح مختلف راگنیوں کے اوقات اور تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہندوستانی موسیقی کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں۔ اسی سلسلے میں تال اور سُر نیز کلاسیکل موسیقی اور عوامی مذاق کا فرق بیان کیا ہے۔

مُشران مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی موضوع کو لیتے تھے تو اس کے باریک سے باریک جزئیات کو بھی بیان کر جاتے تھے۔ چنانچہ موسیقی سے تعلق رکھنے والے اس خطبے میں مشکل ہی سے انھوں نے کسی گوشے کو تشنۂ اظہار چھوڑا ہوگا۔ فن موسیقی کی اہمیت، ہندوستانی موسیقی، رقص و موسیقی کا باہمی ربط، راگنیوں کے اوقات، ہندوستانی موسیقاروں کے کمالات اور پھر اس ضمن میں موجودہ، نیز گزرے ہوئے بعض ارباب کمال کا ذکر، عالمانہ تبحر اور

وسعتِ نظر کے ساتھ عربی موسیقاروں اور عہد عباسیہ کی فنی ترقیوں کا بیان فارسی مغنیہ ل (بار بد ونگیسا) کے دوش بدوش اسحاق موصلی، ابراہیم اور مشہور عرب مغنیہ غریب کا تذکرہ اور پھر اموی اور عباسی خلفاء کی قدر دانی فن کے بعض واقعات، غرض موسیقی پر فنی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مختصر وقت اور محدود پیرایۂ بیان میں عوام کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی بیان کیا جاسکتا ہے، وہ سب کچھ اپنے اس خطبے میں بیان کر دیا ہے۔ حقیقۃً کمال خطابت اسی کو کہتے ہیں یُسْران مرحوم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

موضوع کلام کتنا ہی عالمانہ کیوں نہ ہو، مگر انداز بیان ایسا پُرکیف و پُرتاثیر ہونا چاہیے کہ نظر بازوں اور نظر والوں کی تسکین مذاق کر سکے اور دونوں کے نفسی رجحانات کے مطابق ہو۔ کہنے میں یہ چیز جتنی آسان ہے کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔ علمی تحقیق اور حکیمانہ مسائل کے بیان میں، زبان و بیان کی شگفتگی قائم رکھنا اور عوام کے نفسیات کے مطابق کلام کرنا، خداداد ذہانت رکھنے والے خطیبوں کا کام ہے۔ فن خطابت کی رو سے خطیب وہی ہے جو زور بیان اور حسن کلام پر قادر ہو، ورنہ بعض علمی مسائل کا بیان تو کسی آدمی کو خطیب بنانے کے لیے کافی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے واعظ یا ذاکر کہہ سکتے ہیں، خطیب اور چیز ہے۔ خطیب کا مقصد اصلی صرف تحقیق علمی نہیں ہے بلکہ فن تقریر کا کمال بھی ہے۔ یوں سمجھیے کہ غایت خطابت خود خطابت ہے۔ پند و وعظ اور ذکر و فکر، بعد کی منزلیں ہیں۔ عربی خطباء محض اُسی شخص کو خطیب کہتے تھے جو سحر بیان اور جادو کے تقریر سے سامعین کو مسحور کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور حقیقۃً خطیب ہے بھی وہی۔ فن خطابت، فنون لطیفہ کے شمار میں آتا ہے۔ یہ بھی موسیقی، مصوری اور شاعری کی طرح ایک وہبی ملکہ ہے جو قدرۃً انسان کو ودیعت ہوتا ہے۔ مشق و مزاولت سے مہارت کلام پیدا ہو سکتی ہے، مہارت کمال نہیں۔ دنیا میں جتنے مشہور خطیب گزرے ہیں سب قدرت کی طرف سے اس ملکہ کو لے کر آئے تھے۔ سحبان وائل وغیرہ اپنے کمال فن کے لیے کسی مشق و تعلیم کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ خطبات مُسْران کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسْران مرحوم بھی مبدا فیاض سے یہ ملکۂ وہبی لے کر پیدا ہوئے تھے

البتہ مشق و مزاولت اور وسعت علم اور مطالعے نے اس شراب کو دو آتشہ اور اس ملکے کو دو چند کر دیا تھا۔

آپ پنڈت جی کے تمام خطبات پر شروع سے آخر تک ایک نظر ڈال جائیے اور پھر یہ غور کیجیے کہ یہ شخص کس طرح خطبے کا آغاز کرتا ہے، پھر آہستہ آہستہ کس طرح موضوع کو چھیڑتا ہے اور گریز کی نزاکت قائم رکھتے ہوئے نفس مضمون کو ہاتھ لگاتا ہے، درمیان میں دلچسپ اشعار سے کلام کو مزین اور بامزہ کرتا جاتا ہے، خاتمے کی طرف کس غیر محسوس طور پر رجوع کرتا ہے اور پھر اچانک کس طرح ختم کر دیتا ہے کہ طبیعت پر انقطاع بیان ذرا بار نہیں ہوتا، بلکہ اشتیاق کی آگ شعلہ زن رہتی ہے، نہ صرف یہ، بلکہ جس مسئلے پر بحث کرتا ہے اس کے مطابق، زبان میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور مسئلۂ متعلقہ کی جزئیات اور مناسبات کس طرح واضح ہوتی چلی جاتی ہیں، تو آپ یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب سے پچاس برس قبل یعنی فروری ۱۸۹۳ء میں پنڈت جی نے، آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو وکیل ہائی کورٹ کی بے وقت وفات پر ایک تعزیتی تقریر کی تھی۔ اس تعزیتی تقریر کو پڑھنے کے بعد کون شخص ایسا ہوگا جو فاضل مقرر کے انداز خطابت سے متاثر نہ ہو جائے۔ ملحوظ رکھیے کہ یہ ایک تعزیتی تقریر ہے، اس لیے پنڈت جی نے اس کی ابتداء ایک مرثیے سے کی ؎

ہر ایک گلشنِ عالم میں مُو پریشاں ہے چمن میں سنبل تر زلف سوگواراں ہے
ہر ایک شاخ اُٹھائے ہے ہاتھ ماتم کا ہر ایک نخل پہ بلبل بھی مرثیہ خواں ہے
چمن میں پہنے ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک برنگ دیدۂ تر نرگس آج گریاں ہے

رواں ز دیدۂ نرگس سرشک شبنم شد
فغاں کہ ہر شجرِ باغ نخل ماتم شد

ان پُرتاثیر اشعار کے بعد انھوں نے نثر میں اس طرح مرثیہ خوانی کی ہے:۔

"جس طرف دیکھیے حسرت و غم کے آثار نظر آتے ہیں۔ در و دیوار سے ماتم کی آواز آ رہی ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر حزن و ملال ہے۔ آسمان[1] پر

[1] اتفاق سے اُس روز ابر فضائے سماوی میں محیط تھا ۱۲

ابرِ سیاہ کے ٹکڑے مجتمع ہیں کہ اشک ریزی کریں - آج دوپہر سے آسمان کی آنکھیں اشک آلود نظر آتی ہیں - قریب ہے کہ فرطِ غم سے اس کے آنسو ٹپک پڑیں، آپ لوگ خاموش ہیں اور سکتے کے عالم میں ہیں"

اس دردناک اور پُراز جذبات تمہید کے بعد وہ نفسِ مطلب کی طرف گریز کرتے ہیں - دیکھیے گریز کس قدر برمحل اور قدرتی ہے :-

"یہ خاموشی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ کسی بڑے ہر دلعزیز، حبیبِ وطن، بہی خواہِ ملک اور راستباز بزرگ کا ماتم ہے"

اس گریز کے بعد متوفی کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف و کمالات گِنائے ہیں جو ہر شخص کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں - مثلاً ان کی ایمانداری، حب الوطنی، عزمِ محکم، قوم پرستی اور راستبازی وغیرہ وغیرہ -

متوفی کا ذکر کرتے کرتے نثر میں نظم کی شان پیدا ہو گئی ہے - تاثیرِ بیان، منظر نگاری اور سامعین کے جذبات کو اُبھارنے کی ایک شاندار مثال حسبِ ذیل فقرات میں مل سکتی ہے - فرماتے ہیں اور کس درد سے فرماتے ہیں -

"صاحبو! اُس وقت (جب متوفی کی رسوم آخر ادا ہو رہی تھیں) عجیب عبرت انگیز سماں تھا - سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ جسم جو ملک کے قالب کے لیے روحِ رواں تھا، بے حس و حرکت پڑا ہے اور قریب ہے کہ آگ اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دے"

آخری دیدارِ میت کی منظر کشی ان لفظوں میں کرتے ہیں :-

"تمام عزیزوں کا لاش کے گرد جمع ہونا، ستم رسیدہ بیوہ، مظلوم ماں اور چھوٹے چھوٹے بچّوں کا گریۂ و زاری کرنا، سر دھننا، سینہ کوبی کرنا، یہ ایسا سماں تھا کہ خیال کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں - ہر شخص کی یہ کیفیت تھی ؎

نہاں چہرہ در گردِ مظلومیئے   ز مژگاں رواں اشک محرومیئے

نہ از رنج کف ہا بسر می زنند　　بسوئے عدم بال و پر می زنند

——اس کے بعد متوفی کے وارثوں کو تسلّی و تشفی دینے کے لیے جو کلمات ارشاد کیے ہیں وہ دقتی تاثیر کے علاوہ حقیقت مَوت کے مشکل ترین فلسفے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور خود ان کی شاندار مَوت پر پوری طرح صادق آتے ہیں - فرماتے ہیں -

"مَوت حقیقت میں مادی جسم کو ہلاک کر سکتی ہے، نام نیک کو فنا نہیں کر سکتی - دولت وحشمت سب فانی چیزیں ہیں، مگر نام نیک ہمیشہ زندہ رہے گا ہ

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت　　نوشیرواں نہ مرد کہ نام نکو گزاشت

تمہید، گریز، نفس مطلب اور کلام کے عروجی نقطے سے گزر کر خاتمے کے چند لفظوں میں اپنے تمام جذبات تعزیت اس طرح سمو دیتے ہیں :-

"صاحبو! اب فرط رنج و الم، طول بیان سے مانع ہے اور طوالت کلام اس محل پر خلاف ادب بھی ہے، لہذا اپنے ماتمی بیان کو اس رزولیوشن پر ختم کرتا ہوں"

——اس مختصر سے جملے میں پنڈت جی نے تمام سامعین کے جذبات کو اپنا لیا ہے اور ختم بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر کو سننے والوں کے تعزیتی احساسات کا مرقع بنا دیا ہے -

خطبات مُشران کی ابتدائے تقریر، وسط کلام اور خاتمۂ بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعوے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی، تقریر کے آرٹ، سے بخوبی واقف تھے، عوام کی نفسیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی، وہ دلوں کو تڑپانے اور دماغوں کے متحرک کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی زبان میں لوچ تھا - لفظوں میں روانی تھی، نثر کو نظم سے سجاتے تھے اور نظم کو نثر سے تقویت دیتے تھے، دَوران تقریر میں عوام کے معیار انتخاب کو مدنظر رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کی تاثیر اپنے حرف حرف میں رکھتے ہیں -

ہم نے سطور بالا میں ان کے خطبوں کے چند اقتباسات پیش کیے ہیں اور وہ بھی

بلا قصد و اہتمام کے۔ اگر بامعان مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہر ایک خطبے میں یہی خصوصیات کم و بیش نظر آتی ہیں۔ پنڈت جی کا ہر خطبہ نظم و نثر کا ایک دلکش مجموعہ ہوتا ہے۔ انتخاب شعر اور پھر نثر کی روانی میں پسندیدہ اشعار کا برمحل استعمال بہت مشکل فن ہے۔ اس کے لیے زبردست حافظہ، غیر معمولی ذوق سخن اور برمحل یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم پنڈت جی کے ذوق سخن کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرحوم نے نثری فقرات میں شعروں کو اس طرح کھپایا ہے کہ نثر سئے دو آتشہ کا مزہ دیتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ مثال میں معمولی اشعار پیش نہیں فرماتے بلکہ اساتذہ عرب و عجم اور ہندوستان کے مشاہیر شعراء کا، اعلیٰ درجے کا کلام ان کی زبان پر ہے اور وہ بے تامل اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں جابجا انگریزی شعراء کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔

پنڈت جی، عامیانہ اور پیش پا افتادہ مضامین میں اپنے زور تخیل اور حسن بیان سے ایسی جدت پیدا کر دیتے ہیں کہ خاص و عام اس سے مزہ لیتے ہیں۔ ایک الوداعی خطبے میں اپنی ہیچمدانی اور اپنے پیشرو مقررین کی عظمت کا اعتراف (جو کہ ایک فرسودہ مضمون ہے) اس طرح کرتے ہیں:-

"ان فصیح و بلیغ مضامین کے بعد جو آپ سُن چکے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ میرے لیے زیادہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

میں اپنے خیالات کو شاید اس خوبی سے ظاہر نہ کر سکوں، جس خوبی سے میرے دوستوں نے ظاہر فرمائے ہیں کیونکہ میں فصاحت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر سوچتا ہوں کہ چڑیا اگرچہ شاہباز کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم چار و ناچار اسے اڑنا ہی پڑتا ہے ؎

دانم نہ رسد ذرہ بخورشید و لیکن شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

ایک اور وداعیہ خطبے میں اپنے ممدوح کے لیے جو مدحیہ اور دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں اُن کو ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرنا خالی از لذت نہ ہوگا کیونکہ ان میں

جدت پسندی اور حق پسندی، جو کہ بظاہر ضدین ہیں، پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"میں خاقانی یا انوری نہیں ہوں کہ ثنا یا دعا میں شاعرانہ مبالغہ کروں۔
میں یہ نہ کہوں گا کہ آپ فیاضی میں ابرنیساں یا ایثار و کرم میں حاتمِ دَوراں
ہیں۔ میں نہ کہوں گا کہ آپ کی عمر ہزار برس کی ہو — یہ کہوں گا کہ جب تک
آپ اس دارِفانی میں زندہ رہیں، با کام و بامراد زندگی بسر کریں"

مختصر یہ ہے کہ جدت ادا، حُسن بیان، لطف زبان، ادبی چاشنی، علمی عظمت، روانی، چستی بندش، نُدرت تراکیب، معانی و مطالب کی تسہیل اور سب سے بڑھ کر عوام کے نفسیات سے لگاؤ، ان خطبات کی نمایاں خصوصیات ہیں، جن کی توضیح و تشریح کے لیے ہم نے جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے ہیں جن کے مطالعے سے خطیب کی ذکاوت اور ذہانت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے لیکن قارئین پر ظلم ہوگا کہ انھیں دیر تک پنڈت جی کے خطبات سے محروم رکھا جائے اور تمہید کو اس قدر طول دیا جائے کہ اہل محفل اکتا جائیں ع کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند — البتہ اتنا بتلا دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ پنڈت جی کی جامعیت علمی اور خطابیانی عظمت کو ان ہی چند خطبوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعے میں ۵۱ خطبے شامل ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ع جو ذرہ جس مقام پہ ہے آفتاب ہے — یقیناً خطبات مُشران کی اشاعت سے ادب اُردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہو رہا ہے جس کی اشاعت کے لیے ہم مرحوم کے خلف الرشید پنڈت جگموہن نراین صاحب مُشران، سابق ڈسٹرکٹ جج کے مرہون منت ہیں کہ موصوف کے علمی شوق نے اس نگارخانۂ سخن کو منظرِ وجود پر آراستہ کیا ؎

تو مپندار کہ ایں نغمہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آواز من است

ناچیز نسیم امروہوی

خطبات

شعراء کا خیر مقدم

اور

شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ

بھارتی پاٹھشالا فرخ آباد کی نمایش کے سلسلے میں حسب دستور ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی، جس کی مسند صدارت پر جناب منشی نصیر الدین صاحب علوی (منصف مین پوری) جلوہ افروز تھے اور مُشران صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ موصوف نے اس جلسے میں شعراء و سامعین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد شعر و سخن پر حسب ذیل عالمانہ اور محققانہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ در حقیقت موصوف کا علمی و ادبی شاہکار ہے۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بطور صدر استقبالیہ کمیٹی کے آپ صاحبوں کا خیر مقدم کروں۔ پہلے مجھے کمیٹی کا شکریہ اپنی طرف سے ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کے واسطے انتخاب فرمایا۔ ع منت شناس ازاد کہ بخدمت بداشتت۔ کاش یہ کام کمیٹی کسی شاعر کے سپرد کرتی جو نظم میں یا شگفتہ نثر میں آپ کا شکریہ

ادا کرتا! بخلاف اس کے یہ خدمت ایک شخص غیر شاعر کو تفویض کی گئی ہے، جو ٹوٹی پھوٹی نثر میں آپ کا خیر مقدم کرے گا۔

میں استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے تمام ارباب سخن کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس بزم سخن کو رونق تازہ اور زینت بے اندازہ بخشی ہے۔ جو اصحاب دور سے تشریف لائے ہیں وہ خاص طور پر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم سب کو جناب صدر مشاعرہ اور میزبان مہرباں کا شکریہ نہایت گرمجوشی سے ادا کرنا چاہیے، جن کی صدارت اور رہنمائی سے اور جن کی مہمانداری اور خوش انتظامی سے یہ بزم سخن آراستہ و پیراستہ ہوئی ہے۔ آپ دونوں صاحبوں کا اخلاق عمیم اور اس کا جذب مقناطیسی ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے۔

صاحبان والاشان! اب مشاعرے کی طرف لوگوں کا ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ کسی تقریب سے کوئی انجمن کیوں نہ ہو وہ مشاعرے پر ختم ہوتی ہے۔ جیسے لوگوں کو عمدہ کھانے کھلائے جائیں اور بعد میں اور لذیذ میوے انواع واقسام کے میز پر چُننے جائیں تو باوجودیکہ لوگ سیر ہو چکے ہیں تاہم اُن لذیذ میووں کو نہایت شوق سے کھاتے ہیں، یہی حال مشاعرے کا اہل ذوق کے ساتھ ہے کہ باوجودیکہ پہلی تقریبوں اور جلسوں کا لطف اُٹھا چکے ہیں لیکن آخر میں بزم مشاعرہ میں نہایت شوق سے شریک ہوتے ہیں اور اس کا لطف علیحدہ حاصل کرتے ہیں۔

صاحبان ذیشان! مجھ سے میرے دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ شکریے کی تقریر کے ساتھ شعر و سخن کے موضوع پر بھی کچھ بیان کرنا چاہیے۔ اگر میں تعمیل نہ کروں تو وہی بات ہوگی کہ "آزردن دل دوستاں جہل ست"۔

میں اس وقت فصاحت و بلاغت کے موضوع پر کچھ عرض کروں گا اور فن شعر خوانی کے کچھ اصول بھی بیان کروں گا۔ یہ سب موضوع بزم مشاعرہ سے تعلق خاص رکھتے ہیں۔ میں بہت خوشی سے دیکھتا ہوں کہ طلبہ کی جماعت بھی یہاں موجود ہے جو مشق سخن کرنے والے ہیں۔ ان کو بہت ضرورت ہے کہ شاعری کے آداب سیکھیں، اگر شاعر بننا چاہتے ہیں۔ یہ ابھی نو آموز ہیں، میں ان کی خاطر بھی ملحوظ رکھوں گا اور ایسی باتیں عرض کروں گا جو ان کے سمجھنے اور غور کرنے اور عمل کرنے کے قابل ہوں گی۔ ان کو بہت سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھنا چاہیے:۔

ع کاندریں راہ خارہا باشد

ان کو بھی وہی آداب و قواعد سیکھنا چاہیے، جو فصحاء کے نزدیک مسلّمات سے ہیں۔

میں پہلے فصاحت کا ذکر کروں گا۔ فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سادہ، سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں۔ غریب و ثقیل اور قلیل الاستعمال لفظوں سے پرہیز کیا جائے، باہم الفاظ میں تنافر نہ ہو۔ اگر کوئی لفظ غریب یا ثقیل آجائے تو اس ترکیب سے استعمال ہو کہ اس کی غرابت یا ثقالت جاتی رہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمے کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود فصیح ہے، لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدّین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے اور نغمہ بگڑ جائے گا۔ کہیں ضرورت ہے کہ گندھار سُر، الاپا جائے اور مغنّی وہاں کوئی

دوسرا سُر پنچم، دھیوت، نکھاد، رکھب وغیرہ شروع کردے تو نغمہ بگڑ جائے گا۔ یہی حال الفاظ کا ہے۔ لازم ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اُس کے گرد و پیش کے الفاظ کو اُس کے ساتھ ایک قسم کا تناسُب یا توازُن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ ایک مِصرع لیجیے ع۔ جنگل کے شیر گونج رہے ہیں کچھار میں۔ جنگل، دشت، صحرا اور بادیہ سب مرادفات ہیں، لیکن اگر مصرع مذکور میں بجائے جنگل کے صحرا کہیں تو فصاحت کا خون ہو جائے گا۔ حالانکہ چاروں الفاظ مذکورہ بالا سب بجائے خود یکساں فصیح ہیں، اور کثیر الاستعمال بھی ہیں۔ اسی طرح اس مصرع میں کہ ع "تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا"۔ بجائے صحرا کے جنگل کا لفظ نہیں آسکتا اور مُخلِ فصاحت ہے۔ دامن دشت، دامن بادیہ، روزمرہ کے خلاف ہے۔ قاآنی نے اپنے ایک شعر میں قلیل الاستعمال لفظ نظم کیے ہیں، مگر ثقالت و غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ اوّل چند الفاظ کی تشریح سُن لیجیے پھر شعر عرض کروں گا۔ قصر کی جمع قصور صحیح ہے، لیکن کثرت سے استعمال نہیں ہوتی۔ فارسی میں قصور بمعنی فروگزاشت یا کمی اکثر استعمال ہوا ہے۔ جیسے حور، دوراز قصور۔ اسی طرح ملاط بمعنی گارا اور حصار بمعنی سنگریزہ یا روڑا۔ شاعر کہتا ہے۔

قصورش بافلک ہمسر، ہمہ خشتش زسیم و زر   ملاطش نافہ از فر، حصاتش لولوئے لالا

غور کیجیے، قصور کے بعد الفاظِ "بافلک ہمسر" کو سُن کر سامع سمجھ لے گا کہ یہاں قصور بمعنی خطا نہیں ہے کیونکہ الفاظِ "بافلک ہمسر" موجود ہیں۔ اسی طرح روڑے اور گارے کی مناسبت سے اینٹ کا لفظ لکھ دیا کہ ایک قسم کا تناسُب یا

توازن ہوجائے - گارے کو نانے سے اور سنگریزوں کو موتیوں سے تشبیہ دے کر بھی غرابت اور ثقالت کو کم کردیا -

فصاحت کے تحت میں مطلع کا حال عرض کروں - اکثر شاعر نہیں جانتے کہ مطلع میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے - اکثر اچھے شاعروں سے بعض دفعہ چوک ہوجاتی ہے - واضح ہو کہ مطلع میں بہت سلیس اور فصیح الفاظ جو روزمرہ میں داخل ہیں استعمال ہونا چاہیے اور ثقیل اور قلیل الاستعمال اور دقیق الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے - نواب کلب علی خاں والی رامپور اچھے فارسی گو تھے اور ذی علم بھی، اُنھوں نے اپنی غزل کا مطلع کہا ہے ؎

لئیق وازکی وارشد طلیق وعاقل ودانا   نہ باشد چوں منے درملک ہستی کامل ویکتا

مشہور شاعر سنجر شیرازی جو میرزا سپہر لسان الملک کا شاگرد رشید تھا، اُس وقت بریلی اور مُراد آباد کی سیر و سیاحت کررہا تھا - اُس کے ہاتھ یہ غزل کسی طرح لگ گئی - اُس نے اس غزل کے ایک ایک مصرع میں اصلاح دی اور ایسی اصلاح دی کہ باید وشاید - اُس نے یہ استدلال کیا کہ ہندیوں کے لہجے میں واوِ مجہول اور یائے مجہول ہے، لیکن ایرانیوں کے لہجے میں معروف ہے، مجہول قطعی نہیں - لہذا گو ہندی لہجے میں "منے" کی یا کا لہجہ مجہول کیا جائے گا، مگر ایرانی اُس کو یائے معروف ہی پڑھیں گے - پس 'منی' کا لفظ اکراہ پیدا کرے گا - کیونکہ قرینہ دوسرے معنی کا موجود نہیں ہے - البتہ خسروِ اقلیم سخن سعدی نے کہا ہے ؎

کہ ملکش قدیم ست وذاتش غنی   مراُو را رسد کبریا و منی

کبریا کے بعد واو عاطفہ موجود ہونے سے دوسرے معنی کا قرینہ صاف ہے۔
پس یہ مصرع نواب کو یوں کہنا چاہیے تھا۔ ع

نباشد ہمچو من در ملک دانش کامل و یکتا

اسی طرح دوسرا مصرع الفاظ غریب وثقیل کو شامل ہے۔ یوں بدلنا چاہیے۔

فصیح و خوش بیان و بذلہ سنج و عاقل و دانا

چونکہ میں مطلع کا بیان کر رہا ہوں اس لیے یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ بعض شاعر صنعت سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے۔ " باید کہ مطلع از صنعت سجع عاری باشد" ہمپایۂ انوری و خاقانی میرزا حبیب اللہ قاآنی (ملک الشعرائے فتح علی شاہ قاچار والی ایران) نے صنعت سجع میں ایک لاجواب قصیدہ کہا ہے، جو کسی وقت بی، اے کے کورس میں داخل تھا۔ اس کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے ؎

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا ۔۔۔ جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

اور بھی بیسوں شعرائے عجم نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ سبھوں نے مطلع کو صنعت سجع سے عاری رکھا ہے۔ میرزا سپہر لسان الملک ملک الشعرا کہتا ہے ؎

چہ سودا در سر افتادم کہ نے سر ماند و نے سودا ۔۔۔ چہ طوفاں کند بنیادم کہ ہم شد کلبہ ہم کالا

میرزا فتح علی خاں صبائے کاشانی کہتا ہے ؎

بناز اے تخت اسکندر ببال اے مسند دارا ۔۔۔ کہ شد اسکندر دیگر بدارائی سریر آرا

میرزا فضل اللہ خاور شیرازی کہتا ہے ؎

ہمو مینا ہمو ساقی ہمو ساغر ہمو صہبا خمار از اوست در سرہا نشاط از اوست در دلہا

ملاحظہ کیجیے، سب کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے حالانکہ یہ نظمیں تمام و کمال صنعت سجع میں ہیں۔ ایک ہندی شاعر نے جس کی غزل بلکہ نظم مثل اہل عجم کے گرانمایہ ہے، صنعت سجع میں قصیدہ کہا ہے لیکن مطلع کو صنعت مذکور سے عاری نہیں رکھا۔ یہ بمقتضائے بشریت تھا یا ممکن ہے کہ ہندی نژاد ہونے کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ ع "زبان غیر کیا، آتی نہیں اپنی زباں برسوں" وہ کہتا ہے:–

چہ بستانے مشام آرا طرب انگیز روح افزا گزشتم بو ستانے را شبے در عالم رویا

اب میں بلاغت کا ذکر کروں گا۔

صاحبو! بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کے روبرو بلاغت کی تعریف اس طرح کروں گا کہ سب کے ذہن پر مرتسم ہو جائے اور جو کچھ فصحاء نے لکھا ہے اس کا لب لباب ہو۔ جب اوّل اوّل بلاغت کے اصول مدوّن کیے گئے تو واضع نے بلاغت کا جزو اعظم یہ قرار دیا کہ "بلاغتُ الکلام تطابقُ المقام" یعنی یہ کہ کلام حسب مقتضائے مقام ہو۔ چونکہ مقتضائے مقام کے لحاظ سے بلاغت کے اسلوب بیشمار ہو سکتے ہیں، لہذا ایک جامع و مانع اصول واضع نے قرار دے دیا۔ جب زمانے نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا تو علماء نے دیکھا کہ یہ تعریف بلاغت کافی نہیں ہے۔ بلکہ ناقص ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا کلام حسب مقتضائے مقام ہو لیکن بہت بھدے اور بھونڈے طریقے سے کہا ہو تو کیا وہ عبارت بلیغ

کہی جائے گی ؟ ہرگز نہیں - لہذا ضرور ہے کہ عبارت فصیح بھی ہو- اب دوسرا جزو بلاغت کا یہ قرار پایا کہ کلام فصیح بھی ہونا چاہیے - جب ہارون رشید خلیفہ عباسی کا عہد آیا تب اُس نے کہا کہ ہنوز بلاغت کی تعریف ناقص ہے - ممکن ہے کہ ایک شخص کلام حسب مقتضائے مقام کرے اور فصاحت بھی ہو ، لیکن اگر وہ تکرار لفظی کرتا ہے یا مضمون کی تکرار اُس کے کلام میں ہے یا وہ تھوڑے سے مضمون کو بہت مطول عبارت میں کہتا ہے تو کیا اُس کا کلام ، بلاغت التزام کہا جا سکتا ہے ؟ نہیں ہرگز نہیں ، اُس کا قول تھا "اَحسَنُ الکلامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ " یعنی سب سے اچھا کلام وہ ہے جس میں تھوڑی عبارت میں وسیع معنی پیدا ہوں - چونکہ ہارون رشید اقسام علوم میں یگانۂ روزگار تھا اور مجتہد کا درجہ رکھتا تھا ، اس کا قول علماء نے پسند کیا اور تیسرا جزو بلاغت کی تعریف میں حسب تجویز ہارون رشید اضافہ کیا گیا - اب بلاغت کی تعریف مکمل ہوگئی - یعنی (۱) کلام حسب مقتضائے مقام ہو - (۲) کلام میں فصاحت بھی ہو اور (۳) عبارت "ما قَلَّ وَدَلَّ" ہو - یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں -

میں آپ کو پہلے بلیغ نثر کی ایک مثال دوں جو مورخوں کے نزدیک بہت مشہور ہے - مامون الرشید خلیفہ عباسی کا قائد اعظم طاہر ذوالیمینین تھا جو سیف و قلم دونوں کا مالک سمجھا جاتا تھا - اُس نے مامون کو ایک خط لکھا - مورخوں نے اُس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے - وہ یوں ہے " میں امیرالمومنین کو خط لکھ رہا ہوں - فوج اور سرداران فوج اطاعت و انقیاد کے اُس اعلیٰ درجے پر

ہیں جہاں تک ایسی فوج کا ہونا ممکن ہے جس کی تنخواہیں چڑھی ہوں اور وہ تباہ حال ہو رہی ہو۔" اس جملے کے چھ معنی ہو سکتے ہیں کہ (۱) ظاہر شکایت کرتا ہے کہ آپ کیوں تنخواہیں چڑھائے ہوئے ہیں جس سے فوج تباہ حال ہو رہی ہے۔ تنخواہیں ادا فرمائیے۔ (۲) فوج گو بظاہر مطیع ہے اور بغاوت نہیں کرتی ہے لیکن بہت بیدل ہے، اگر تنخواہوں کے ادا کرنے میں دیر ہوگی تو آمادہ بغاوت ہو سکتی ہے۔ (۳) یہ میری کارگزاری بحیثیت سپہ سالار کے ہے کہ فوج مطیع و منقاد ہے اور باوجود اُس کی بے دلی اور تباہ حالی کے، میں اُس کو بغاوت سے روکے ہوئے ہوں۔ (۴) فوج کی تنخواہیں فوراً ادا ہونا چاہیے تاکہ اُس کی تباہی دور ہو، ورنہ وہ جلد بغاوت اختیار کرے گی۔ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ حضور کو اطلاع دے کر اپنے فرض سے ادا ہوتا ہوں۔ بہت اندیشہ ہے کہ ملک میں شورش پیدا ہو جائے۔ (۵) فوج گو مطیع ہے لیکن بے دلی کے ساتھ اطاعت بظاہر کر رہی ہے۔ اس اطاعت و انقیاد پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ ایسی فوج ہرگز جاں نثاری نہیں کر سکتی اور وقت کی منتظر رہے گی اور دھوکا دے گی۔ (۶) اگر تنخواہیں ادا ہو جائیں گی تو فوج کی بے دلی اور تباہی دور ہو جائے گی اور مثل سابق فوج اطاعت شعار فرماں بردار اور جاں نثار ہو جائے گی۔

اب نظم کی مثالیں سنیے۔ بلاغت کے تمام اسلوب کا احصاء کرنا بوجہ ضیق وقت کے ناممکن ہے۔ صرف چند اسلوب کافی ہوں گے۔

مقبلؔ نے فارسی میں مرثیہ کہا ہے۔ چنانچہ ایک شعر اُس کا ملاحظہ ہو ؎

بلند مرتبہ شاہے زصدر زیں افتاد　　　اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

امام حسینؑ کو شاہ بھی کہتے ہیں۔ جیسے جناب رسالتمآب صلعم کو شہنشاہ عرب۔ فقط شاہ کہنا شاعر نے کافی نہ سمجھا۔ بلند مرتبہ کے الفاظ بڑھائے۔ پھر کہا 'زصدر زیں افتاد'، زین کو صدر قرار دیا۔ اگر شاہ کی جگہ فقط 'حسینؑ' کہتا اور یہ کہتا کہ " ز زین اسپ افتاد'، تو مطلب نکل آتا۔ مگر وہی بات ہوتی کہ ؎

دندان تو جملہ در دہان اند　　　چشمان تو زیر ابروان اند

جو الفاظ شاعر نے مصرع اول میں کہے اُن سے جناب امام عالی مقام کی شان رفیع دکھائی، پھر دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ گویا عرش زمین پر گر پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب عرش گرے گا تو زمین کے اندام میں لرزہ آجائے گا بلکہ زمین پاش پاش ہو جائے گی۔ شاعر کا مقصود ان الفاظ سے یہ ہے کہ سننے والوں کے دل ہل جائیں کہ بڑا سخت واقعہ ہوا۔

اب حضرت انیسؔ مرحوم فردوسی ہند کے کلام سے بلاغت کے اسلوب ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے موقع عرض کر دوں تاکہ پورا لطف حاصل ہو۔ موقع یہ ہے کہ حضرت زینبؑ کے دونوں فرزند عونؑ و محمدؑ شربت شہادت نوش فرما چکے ہیں۔ حضرت عباسؑ علم بردار حضرت زینب علیہا السّلام سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں، مگر وہ انکار کرتی ہیں۔ اس بنا پر کہ اگر تم مارے گئے تو میرے ماں جائے کا یار و یاور کون باقی رہے گا جو تمھاری مثل جاں نثار اور اُن کا قوت بازو ہو، لیکن حضرت عباسؑ اصرار کرتے ہیں کہ میں جاؤں گا۔ حضرت انیسؔ حضرت عباس علیہ السلام کی زبان سے کہتے ہیں کہ اے بہن ؎

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبر سا لالہ فام شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
للہ رو کیے نہ اب اے خواہر امام وہ امر کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام
بیکس ہوں، ساتھ ماں نہیں، سر پہ پدر نہیں
میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

صاحبو! یہ بند بظاہر اس قدر صاف ہے اور سلیس اور عام فہم اور الفاظ اس قدر سادہ اور دلنشیں ہیں کہ بلاغت کے نکتوں کی طرف ذہن یکایک انتقال نہیں کرتا۔ مگر نکات کو ملاحظہ فرمائیے۔ بند کے تیسرے مصرع میں "خواہر امام" کے الفاظ نہایت بلیغ ہیں۔ حضرت عباسؑ حضرت زینب کو امام حسینؑ کی بہن کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ حضرت عباسؑ کی بھی بہن تھیں۔ ان الفاظ سے اُن کی شان رفیع دکھانا مقصود ہے اور در پردہ تعریض ہے کہ آپ مجھ سے وہ محبت نہیں رکھتیں جو حقیقی بھائی بہن میں ہوتی ہے۔ چونکہ درحقیقت حضرت زینبؑ اُن کی حقیقی بہن نہیں، یہ تعریض زیادہ چبھتی ہوئی ہے۔ تعریض وہی زیادہ مؤثر ہوتی ہے، جس میں واقعیت کا پہلو ہوتا ہے۔ پھر ٹیپ کا آخری مصرع نہایت کارگر ہے۔ "میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں"، یعنی آپ مجھ کو اگر بیٹا سمجھتیں تو مجھے بھی اپنے صاحبزادوں کی طرح میدان کارزار میں جانے کی اجازت دیتیں تاکہ میں بھی جناب امام حسینؑ پر نثار ہو جاتا اور شہادت کی دولت حاصل کرتا۔ پس مجھے اپنا غلام ہی سمجھ کر اجازت دے دیجیے۔ کیا خوب اپنا انکسار دکھایا ہے اور حضرت زینبؑ کی شان بلند۔

تشبیہ مُرکّب کا حُسن ملاحظہ فرمائیے۔ جب حضرت عباسؑ پر چاروں طرف سے

برچھیاں چلنے لگیں تو اس منظر کو کس قدر خوشنما اور رفیع کر کے دکھایا ہے۔ کہتے ہیں ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے

یا جب اہل بیت ایک رسّی میں باندھے گئے تھے تو اس اہانت آمیز صورت کو کس قدر خوشنما کر کے دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن
جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

ایک اسلوب بلاغت یہ بھی ہے کہ دشمن کا بیان اپنے ممدوح کے مقابلے میں کیونکر کیا جائے۔ یہ نازک موقع ہوتا ہے۔ اگر اُس کو ذلیل، کمزور اور حقیر کہا جائے تو اُس پر فتح حاصل کرنا شان کو بلند نہیں کرتا اور اگر اُس کی شان و شوکت بیان کی جائے تو مرثیے میں حضرت امام کا تقدس مذہبی اُس کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت انیس دشمن کی مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیامِ مرگ کے، ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی، طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

چہرہ مہیب، غیظ سے آنکھیں لہو کے جام
تھرّائے سام خوف سے، کاندھے پہ وہ حسام
موذی سیاہ بخت سیہ دل سیاہ فام
کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علیؑ کا نام
کُندہ سقر کے قعر کا، پُتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

ایک ترک بادشاہ نے اپنے دشمن پر فتح پائی اور وہ قید ہوکر پا بجولاں دربار میں لایا گیا۔ پایہ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پیش کیا۔ اُس میں ایک شعر کی بلاغت پر غور فرمائیے ؎

ہمائے کہ بر عرش کردے خرام گرفتی و آزاد کردی ز دام

بادشاہ نے اس شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا۔ قیدی نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ شاعر کو میری طرف سے دس ہزار روپیہ انعام دو۔ شاعر نے پوچھا کہ تم مجھے کس بات کا انعام دیتے ہو۔ میں نے تمھاری شکست لکھی ہے۔ قیدی نے جواب دیا کہ تم نے مجھے ہُما کہا۔ اگر تم مجھے شغال کہتے تو میں تمھارا کیا کر سکتا تھا۔ غور فرمائیے کہ شاعر نے دشمن کی تعریف میں کس قدر مبالغہ کیا۔ پہلے تو اُس کو ہُما کہا جو ایسا جانور ہے کہ جس پر سایہ ڈال دے وہ بادشاہ ہو جائے۔ پھر اُس کی شان رفیع دکھائی کہ وہ عرش پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن اپنے بادشاہ کی شان کس قدر بلند کی کہ اُس نے ایسے بلند پرواز ہما کو گرفتار کر لیا اور پھر اُس کی طرف سے ایسا بے پروا اور مستغنی ہے کہ اُس کو چھوڑ بھی دیا۔ کیا اچھا اسلوب بلاغت ہے۔

صاحبو! یہاں فتح گڑھ میں ایک جلسے میں ایک اسپیکر نے اپنی تقریر میں بلاغت کا ایک اسلوب نئی طرح کا برتا۔ وہ آپ کے سننے کے لائق ہے۔ ۱۸۸۷ء میں نواب محمد اسحاق خاں جنٹ مجسٹریٹ ہوکر آئے تھے (یہ وہی اسحاق خاں تھے جو ۱۹۰۷ء میں یہاں ججی کے عہدے پر تھے) تھوڑے ہی عرصے میں وہ تبدیل ہوئے تو ان کا رخصتی جلسہ کیا گیا۔ ایک شخص نے

وداعی تقریر میں معمولی مدح و ثنا کے بعد اُن کے شوق شکار کی تعریف بھی کی۔ لوگوں میں سرگوشی ہونے لگی کہ یہ عامیانہ تعریف کیسی۔ شوق شکار کیا قابل تعریف چیز ہے، لیکن اُس شخص نے اس عامیانہ بات کو شاعرانہ پہلو سے بیان کیا۔ یعنی اُس نے یہ کہا کہ ہمارے نواب صاحب ممدوح کو شکار کا شوق ہے اور یہ اُن کی شان کے شایاں ہے۔ نہ اس لیے کہ جانوران صحرائی ہلاک ہوں اور آپ کی تفریح طبع ہو بلکہ اس وجہ سے کہ اس شکار کے ذریعے آپ کو دلوں کا شکار کرنے کی مشق بہم پہونچ جائے ؎

شہاں راضرورست مشق شکار کہ آید پئے صید دلہا بکار

—— اس تقریر کے بعد سامعین نے بہت داد دی اور کہا کہ ہم نے پہلے بیان کو عامیانہ سمجھا لیکن تم نے آخر میں شاعرانہ پہلو اختیار کر کے کلام کو بلیغ کر دیا۔ اب میں بلاغت کے موضوع کو ختم کرتا ہوں اور فن شعر خوانی کے کچھ اصول عرض کروں گا۔

فن شعر خوانی

آپ صاحبوں کو میری زبان سے یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ لوگوں کو فارسی شعر پڑھنا نہیں آتا۔ بعض لوگ فارسی میں خوب استعداد رکھتے ہیں مگر شعر غلط پڑھتے ہیں۔ یعنی جو فن شعر خوانی کے قواعد ہیں اُن سے واقف نہیں۔ پھر اُن پر عمل کرنا یعنی چہ؟ کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن پر یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا ہے۔ بہرحال میری نظر سے نہیں گزرا اور باوجود تلاش کے مجھے نہیں ملا۔ میں ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی ہوگا۔ اس میں مجھے اپنے اجتہاد اور ایجاد و اختراع سے تمامتر کام لینا پڑا۔ اُردو کے اشعار میں جب فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں تو لوگ اکثر اُن کو بھی غلط

پڑھتے ہیں، جیسا کہ میں مثالوں کے ذریعے سے ظاہر کروں گا -

(۱) یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظ کی جگہ ہائے مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظ پڑھتے ہیں -

گدائے کہ برخاطرش بند نیست   بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

بہ کی 'ہا' ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیے کہ 'بہ' کی (ہ) 'از' کی (ز) میں مل کر آواز دے اور 'از' کا ہمزہ گر جائے یعنی آواز نہ دے - اگر اس کی آواز نکالی جائے گی تو 'بہ' کی (ہ) تقطیع میں نہ آئے گی - 'بہز' کی آواز نکلنا چاہیے - اسی طرح اس مصرع میں "دایہ مہر و راہبر بلوغ سہ پسر" سہ کی (ہ) کو ملفوظ نہ پڑھنا چاہیے بلکہ یہ ہائے مختفی ہے اور سین کی حرکت کو اشباع ہے - گو یہ (ہ) تقطیع میں محسوب ہو لیکن کچھ مضائقہ نہیں - چونکہ ہائے ملفوظ و مختفی کا امتیاز مشکل ہے، ان کے کچھ قواعد عرض کردوں -

واضح ہو کہ 'ہا' کی دو قسمیں ہیں - ایک مختفی اور دوسری ہائے ملفوظہ یا مظہرہ - سرمہ، نشانہ، خامہ اور شانہ میں ہائے مختفی ہے اور مہ، شہ، رہ، گنہ اور سیہ میں ہائے ملفوظ ہے - ان دونوں 'ہا' کا قافیہ جائز نہیں - قدماء کے یہاں مثلاً سعدی، صائب، حزیں کے یہاں شاذ و نادر دونوں کا اجتماع ہوگیا ہے - مگر متاخرین کے یہاں جواز نہیں - ہائے مختفی اپنے ماقبل کی حرکت کا اظہار کرتی ہے - خود 'ہا' کا اظہار کسی طرح روا نہیں - اکثر لکھنؤ والے مژہ کو سیہ اور گنہ کی طرح بہائے ملفوظ بولا کرتے ہیں - مژہ کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ لفظ تقطیع میں دو حرفی محسوب ہو 'ژے' کی حرکت دبی زبان سے پڑھتے ہیں جیسے

ع ستم ست بر نگاہم مژہ را نقاب کردن

---- دوسرے یہ کہ سہ حرفی محسوب ہو مگر مضاف یا موصوف واقع نہ ہو تو جس طرح 'دل' بحالت اضافت جب سہ حرفی محسوب ہوتا ہے اُس وقت لام کے کسرے کو اشباع کرتے ہیں جیسے -

دلِ عاشق برنگِ برق تڑپا

---- اسی طرح مژہ کی ژے کی حرکت کھینچ کر پڑھیں گے جیسے

ع - ہو گئی نوکِ مژہ نشتر مجھے

---- تیسرے یہ کہ مضاف یا موصوف واقع ہو وہاں اس 'ہا' کو ہمزہ سے بدل دیں گے جیسے

ع - مژۂ یار نوکِ پیکاں ہے

---- یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ دو حرفی لفظ والی "ہا" کبھی ہمزہ سے نہیں بدلتی۔ یہ بھی جاننے کے لائق ہے کہ ہائے ملفوظ بحالت جمع قائم رہتی ہے - جیسے راہ ہا، چاہ ہا، زرہ ہا، گرہ ہا، اور ہائے مختفی بحالت جمع ساقط ہو جاتی ہے جیسے میوہا، جاہا، خاہا، وغیرہ - اور بحالت تصغیر ہائے مختفی کاف عجمی سے بدل جاتی ہے جیسے جامگک، خامگک وغیرہ - اور بحالت اضافت ہمزہ سے بدل جاتی ہے جیسے جامۂ من، خامۂ من، جامۂ نو وغیرہ - چونکہ دونوں 'ہا' کے غلط لہجے سے ادا کرنے میں شعر غلط ہو جاتا ہے اس لیے میں نے یہ حالات بالتفصیل آپ حضرات کی دلچسپی کے لیے بیان کیے -

(۲) دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ کسی جگہ ذرا ٹھہرنا چاہیے مگر وہاں

پڑھنے والا نہ ٹھہرے اور الفاظ کو ملاتا ہوا پڑھے۔ جیسے اس شعر میں ؎

دمہ، دم فرو گیر چوں چشم گرگ　　شدہ کارگر گینہ دوزاں بزرگ

اگر دمہ کے لفظ پر ذرا دم نہ لیا جائے تو سامع سمجھے گا کہ پڑھنے والا دما دم کہہ رہا ہے اور دمبدم، معمولی معنی قیاس کرے گا جو غلط در غلط ہو جائے گا۔ دمہ کے کئی معنی ہیں۔ ایک معنی سردی کے بھی ہیں اور یہاں یہی معنی مُراد ہیں۔ نظامی نے جاڑے کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے، جشن نوشابہ کے ذکر میں۔ جب دمہ کا لفظ ملایا نہ جائے گا تو سامع اگرچہ دمہ کے معنی نہ جانتا ہو لیکن ذرا بھی ذہن سلیم رکھتا ہو گا تو اتنا سمجھ لے گا کہ کوئی چیز ہے جو دم گھونٹے دیتی ہے، چشم گرگ کی طرح۔ پھر آگے کے اشعار جب کہ پڑھے جائیں گے تو اُن میں صاف صاف جاڑے کا ذکر ہے۔ سامع قیاس کرے گا کہ دمہ سردی کے معنی میں ہے۔ لیکن جب کہ دمہ کو دم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو سامع سوائے دمادم کے کچھ معنی نہیں سمجھ سکتا۔ نہ آگے کے اشعار اس کو دمادم کے معنی سمجھنے میں مدد دیں گے۔

(۳) اسی طرح کسی موقع پر ایک مصرع کے الفاظ دوسرے مصرع میں ملا کر پڑھے جائیں گے جیسے ان اشعار میں ؎

الا تا نگرید کہ عرش عظیم　　بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم

الا تا نخفتی بغفلت کہ نوم　　حرام ست بر چشم سالار قوم

ان اشعار کے لفظوں کی تقسیم اس طرح پر کرنا چاہیے۔

الا تا نگرید، کہ عرش عظیم بلرزد　　ہمی چوں بگرید یتیم

الا تا نخفتی بغفلت، کہ نوم حرام ست   بر چشم سالار قوم

——شعر اول میں لفظ "تگ برید" اور شعر دوم میں لفظ "غفلت" پر ذرا ٹھہرنا چاہیے۔

(۴) بعض الفاظ پر زور دینا چاہیے جس کو انگریزی میں emphasis کہتے ہیں۔ اُس کے قواعد کا احصاء کرنا مشکل ہے۔ صرف مذاق سلیم سے امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون کون الفاظ زور دیے جانے کے قابل ہیں۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں جو عام فہم ہیں۔ موشگافیوں سے قطع نظر کی جاتی ہے ؎

امام ثامن ضامن۔ حریمش چوں حرم آمن   زمین از حزم او ساکن۔ سپہر از عزم او پویا

——پہلے مصرع میں حریم اور حرم پر اور دوسرے مصرع میں حزم اور عزم پر زور دینا چاہیے۔ مذاق سلیم بتاتا ہے کہ حزم اور عزم قوافی ہیں اور حریم اور حرم میں بڑی جنسیت ہے لہذا انہی پر زور دینا چاہیے۔ شاعر کی قادر الکلامی یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں ؎

تنش از قیر آلودہ ولش از شیر آمودہ   بروں پر سرمہ سودہ درون پر لولوے لالا

——مصرع اول میں 'قیر' اور 'شیر' پر زور دینا چاہیے۔

نہال باغ علیینیں۔ بہار مرغزار دیں   نسیم روضہ لیسیں۔ شمیم دوحہ طاہا

——مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم، روضہ اور شمیم، دوحہ، گویا چھ الفاظ پر زور دینا چاہیے ؎

خرد شد ہر دم از گردون کہ پوشد برتن ہامون   ز سنبل کسوت اکسون ز لالہ خلعت دیبا

——اس شعر کے مصرع اول میں 'خرد شد' اور 'پوشد' اور مصرع آخر میں

کسوت، وخلعت پر زور دینا چاہیے کیونکہ یہ تمام الفاظ جن پر زور دیا گیا ہے شاعر کا کمال شاعری ظاہر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سجع کے تین قوافی عموماً زور دینے کے لائق اس وجہ سے نہیں ہوتے کہ شاعر اُن کے لانے کا پابند ہے اور وہ اُن کو تلاش کر کے لانے پر مجبور ہے۔ اُن میں آورد بھی ہو سکتی ہے لیکن اُن کے علاوہ جو اور قوافی شعر میں آ گئے ہیں وہ اُس کی روانی اور سلاست طبعی پر دلیل قاطع ہیں اور اُس کی قادر الکلامی ظاہر کر رہے ہیں اور محض آمد ہی آمد دکھا رہے ہیں لہذا زور دینے کے لائق ہیں۔ غرض کہ وجدان صحیح اس معاملے میں اچھی رہنمائی اور رہبری کرے گا۔

(۵) شعر پڑھنے کے لیے ضرور ہے کہ الفاظ کے اعراب غلط نہ کہے جائیں۔ میں صرف دو لفظوں کا ذکر اس وقت کروں گا جو عموماً غلط بولے جاتے اور غلط پڑھے جاتے ہیں۔ "مطلع اور موقع" اُردو میں بلا ترکیب فارسی جب یہ لفظ بولے جائیں گے تو عموماً 'لام' اور 'قاف' پر فتحہ کہا جاتا ہے اور یہ ٹھیک ہے، اِلّا اُس حال میں کہ جملے میں یہ الفاظ مفعول یا مجرور[1] پڑیں۔ اس صورت میں 'لام' اور 'قاف' پر کسرہ بولا جائے گا۔ لیکن فارسی میں چاہے بلا ترکیب یا مع ترکیب ان کا استعمال کسی طرح ہو 'لام' یا 'قاف' مکسور[2] ہی بولا جائے گا۔ اُردو میں بھی جب یہ لفظ ترکیب فارسی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں تو غلطی سے لہجے میں 'لام' اور 'قاف' کو مفتوح کہا جاتا ہے۔ اس کی احتیاط کرنا چاہیے۔ اسی طرح سیکڑوں الفاظ ہیں

---

[1] جیسے موقع کو، مطلع سے۔ [2] از غیاث اللغات و منتخب۔

جن کے اعراب اگر صحیح معلوم نہیں ہیں تو ان کا لہجہ غلط ہو جائے گا اور شعر غلط پڑھا جائے گا۔ اس موضوع کو ختم کر کے اب میں حرکات اور اشارات کا ذکر کروں گا جن سے شعر خوانی میں کام لیا جاتا ہے۔

حرکات وسکنات واشارات

یورپ میں ایسے ماہرین فن ہیں جنھوں نے تمام عمر کسی ایک فن کے حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ پروفیسر ہارٹلی فن شعر خوانی کے ماہر آکسفرڈ یونیورسٹی میں تھے۔ جنھوں نے ستّر برس کی عمر تک صرف یہ ایک کام کیا کہ شعر پڑھا اور پڑھایا۔ شعر پڑھتے وقت وہ شعر کی صورت بن جاتے تھے اور شعر میں جو جذبات ہوتے تھے اُن کا مجسمہ گویا نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ چہرے کی جُھرّیاں مٹ جاتی تھیں اور خون کا دَورہ چہرے کی رگ وپے میں اس قدر ہوتا تھا کہ چہرے پر جوانی کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ چشم و ابرو کے اشارات اور تیور سے شعر کے جذبات بتاتے تھے۔ ہاتھ کو یا جسم کے کسی اور حصّے کو جنبش نہیں دیتے تھے۔ شعر میں اگر رنج، خوشی، تعجب، حیرت، آرزو، غصہ، رحم، سوگ وغیرہ کا ذکر ہے تو اُس کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی تھی۔ اس فن کے ماہر ہندوستان میں حضرت انیسؔ مرحوم تھے بلکہ ماہر ہونے کے ساتھ اس کے موجد بھی تھے۔ میرے لڑکپن میں ایک بوڑھے آدمی نے جس نے انیسؔ و دبیرؔ کی مجالس عزا دیکھی تھیں، حضرت انیسؔ کا حال شعر پڑھنے کا بیان کیا کہ پہلے وہ جس وقت منبر پر جاتے تھے تو مجلس میں خاموشی اور سناٹا ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کسی سے نہ کرتا تھا۔ پہلے وہ آستین چڑھاتے تھے۔ یہ دیکھ کر

لوگوں کے دل ہلنے لگتے تھے۔ پھر جب وہ مرثیے کا بستہ ہاتھ میں لیتے تھے تو رقیق القلب سامعین کو رقّت شروع ہونے لگتی تھی۔ اور جب وہ پڑھنا شروع کرتے تھے تو سیکڑوں سامعین چہروں کو رومال سے پوچھتے دکھائی دیتے تھے اور بین پڑھتے وقت تو گریہ وزاری اور آہ و بکا کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

اس بیان میں کوئی بات مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بیمار ہوتا ہے یا کسی کے پھوڑا نکلتا ہے اور ڈاکٹر عمل جرّاحی کرنے کے واسطے آتا ہے، تو اُس وقت عزیز و اقربا دوست و احباب جو مریض کے پاس ہوتے ہیں ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُن میں بعض کے دل دھڑکنے لگتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ چیر پھاڑ کا وقت قریب ہے۔ پھر جب ڈاکٹر نشتر کا بکس جیب سے نکالتا ہے تو رقیق القلب لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کون دیکھے، حالانکہ ابھی ڈاکٹر نے کوئی کام جرّاحی کا نہیں کیا ہے۔ پھر ڈاکٹر اپنی جگہ سے اُٹھ کر مریض کے پاس جاتا ہے۔ اُس وقت اشخاص موجودہ میں سے چند شخص اور منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے سرک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عمل جرّاحی کے وقت شاید ہی دو ایک شخص ایسے کڑے جی کے ہوتے ہوں جو چیر پھاڑ دیکھنے کی ہمت کرتے ہوں۔ یہی حال ذاکر کا سامعین کے ساتھ ہے کہ اُس کو منبر پر پڑھنے کے لیے تیار اور آمادہ دیکھ کر سامعین کے دلوں پر رنج و غم اور حسرت و افسوس کی ایک کیفیت طاری ہوگی اور ہر شخص جوش مذہب سے لبریز ہو کر شہدائے کربلا کی شہادت کے حالات سننے اور اہل بیتؑ کی مصیبتوں کا

جانکاہ منظر دیکھنے کو آمادہ ہو جاتا ہوگا، اور آمادہ ہو جانا، ہے بھی ایک فطری امر، کیونکہ کربلا کے خونیں میدان میں خاندان رسولؐ کے بوڑھوں، نوجوانوں اور بچوں کو جس بیدردی سے تڑپا تڑپا کر بھوکا پیاسا شہید کیا گیا، اُس کا حال سُن کر اپنے تو اپنے اغیار بھی رُو دیتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اِس وقت چند ہی کلمات سُن کر بعض حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ مناسب ہے کہ تھوڑا یہ حال بھی سُنا دیا جائے کیونکہ انیسؔ کی داد دینا ان واقعات کے جاننے پر منحصر ہے۔ لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ کربلا پہنچے تو آپ کے ہمراہ صرف بہتّر آدمی تھے۔ جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ کم سِن بچے تھے۔ کچھ مخدرات عصمت تھیں۔ حضرت امام عالی مقام مسلمانوں کے آخری نبی حضرت محمد صلعم کے چہیتے نواسے، بی بی فاطمہؓ کے لاڈلے بیٹے اور حضرت علیؑ کے پیارے فرزند تھے۔ کربلا کا جب واقعہ رونما ہوا تو ۶۱ھ تھا۔ اس وقت مذہب کی آڑ میں مسلمان وہ سب کچھ کر رہے تھے جو ان کے رسولؐ نے منع کیا تھا۔ وہی لوگ اولادِ رسولؐ کے دشمن تھے۔ اُنہی لوگوں نے امام عالی مقام کو بُلا کر مع عزیز واقارب واحباب تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا۔ سب سے اہم واقعہ چھ مہینے کے شیر خوار بچے کا ہے کہ امام عالی مقام اس کو ہاتھوں پر لے کر میدان میں آئے اور اشقیا سے بچے کے لیے پانی کا سوال کیا۔ ایک ظالم نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ وہ بےزبان بچہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر شہید ہو گیا۔ میرے خیال میں تو ایسا ظلم ازل سے اب تک نہیں ہوا اور قیامت تک نہ ہوگا۔ یہی وہ دردناک واقعات ہیں جن کو سُن کر ہر ایک روتا ہے اور امامؑ کے اہلبیتؑ پر شہادت کے بعد جو

مظالم ہوئے اور سخت تکالیف و مصائب کا سامنا ہوا وہ حالات سن کر پتھر دل بھی پانی ہو جائیں اور رقیق القلب لوگوں پر رقّت کا طاری ہونا تو معمولی بات ہے! اور پھر ذاکر بھی کون حضرت انیس مرحوم جن کے پڑھنے کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور جن کا ایک ایک شعر نشتر کا کام کرتا تھا، جن کے ایک ایک لفظ میں خون جگر کی چاشنی ہوتی تھی۔

حضرت انیس صرف چشم و ابرو کے اشارے سے جذبات کو ادا کرتے تھے۔ کبھی خاص موقعوں پر ہاتھ کو بھی جنبش دیتے تھے لیکن اُن کے اشارات وحرکات نہایت متانت کا پہلو لیے ہوتے تھے۔ ایک ذاکر نے اُن کی نقل کرنا چاہی اور چاہا کہ مرثیہ پڑھتے وقت ایسا بتائے کہ ہر بات اور ہر جذبے کو حرکات سے ادا کرے۔ ایک پہلوان کا ذکر آیا۔ مصرع یہ تھا کہ "آیا تھا بھبکتا یہ دبکتا ہوا بھاگا" اس کو انھوں نے یوں بتایا کہ پہلے تو بھبکے اور پھر دب کر اور سمٹ کر پیچھے ہٹے۔ اُن کا بھبکنا اور دبکنا لوگوں کو ایسا بھونڈا اور بیہودہ معلوم ہوا کہ سب ہنس دیے اور بہت دیر تک ہنسی بند نہ ہوئی۔ جب اُنھوں نے بین پڑھے تو کسی کو رقّت نہ ہوئی۔ سامعین منہ پر رومال رکھے ہوئے ہنس رہے تھے اور ضبط نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ذاکر کا بھبکنا اور پھر دب کر پیچھے ہٹنا سب کے پیش نظر تھا۔ غرض کہ ذاکر کو بہت شرمندگی ہوئی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ کجا وہ اور کجا انیس ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ شعر پڑھتے وقت زیادہ بتانا اور خلاف تہذیب

دو اب مجلس اشارات و حرکات کرنا اہل مجلس کے لیے موجب ریش خند ہوتا ہے۔ اس سے پرہیز چاہیے بلکہ چشم و ابرو کے اشارے بھی اعتدال کے اندر رہیں۔ ورنہ ان میں بھی مبالغہ کرنا رقاصہ اور مُغنیہ کے بھاؤ سے مشابہ ہو جائے گا۔ بزم مشاعرہ ہو کہ مجلس عزا سامعین کے نزدیک قابل استہزا سمجھا جائے گا۔ ممالک یورپ میں اس فن کے ایسے ماہر ہیں کہ اگر ایک ہی مصرع یا شعر میں متضاد الفاظ پاس پاس جمع ہوں تو ان کو بھی اشارات و حرکات سے اس خوبی کے ساتھ ادا کریں گے کہ تصنع معلوم نہ ہوگا۔ مثلاً رنج و خوشی، آرام و تکلیف، محبت و نفرت کو اس طرح بتائیں گے کہ رنج کے لفظ پر جو لہجے میں غم ہوگا تو فوراً خوشی کے لفظ پر آواز بدل جائے گی۔ اسی طرح محبت کے لفظ پر ایسی آواز نکلے گی کہ جس سے محبت ٹپکے اور فوراً نفرت کا لفظ آتے ہی آواز اور صورت ایسی بدل جائے گی کہ نفرت برسے۔ یہ تبدیلی آواز اور تغیر صورت بلا قصد ہوگی۔ یہ بات نہایت مشکل ہے۔ عمر بھر محنت کرے تب حاصل ہو سکتی ہے۔ چونکہ اشارات و حرکات سے جذبات کا ادا کرنا فن شعر خوانی سے متعلق ہے اور اس میدان میں قدم رکھ کر لوگ بے راہ چلنے لگتے ہیں اس لیے میں نے بطور مختصر اس کا ذکر کر دیا۔

صاحبان والا شان! میں نے جو موضوع قرار دیے۔ تھے وہ وقت مقررہ کے اندر عرض کیے۔ شرح و بسط کے ساتھ عرض کرنے کے واسطے تو کئی روز درکار ہیں۔ اب میں زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا۔ اکثر حضرات سادہ جی "چند الشعرا"[ل]

[ل] ایک مشہور ظریف شاعر کا تخلص ہے ۱۲

کا کلام سننے کے مشتاق ہوں گے تاکہ تفریح طبع ہو -

اب میں صرف بزم مشاعرہ کی نسبت یہ عرض کروں گا کہ ایسی انجمنوں میں شاعروں اور سخن شناسوں کا جمع ہونا علم و ہنر کے حق میں نہایت مفید ہے اور جو حضرات فن شعر گوئی کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پر تازیانے کا کام کرتا ہے - ایک دوسری خوبی بزم مشاعرہ میں یہ ہے کہ مختلف مذاہب و مراسم و عقائد کے اشخاص ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور باہم برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں جس سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ علم و ہنر کی ترقی کے سوا اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے -

سر سیّد میموریل فنڈ

اور

مُسلم یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل

ماہ ستمبر ۱۸۹۸ء میں بمقام ٹون ہال فرخ آباد ایک جلسہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کا زیر صدارت جناب مسٹر آر، پی ڈیوہرسٹ صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ سر سید میموریل فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ علی گڑھ سے ایک ڈپوٹیشن بسر کردگی جناب آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر آکر فتحگڑھ میں ٹھہرا تھا۔ مرزا عرفان علی بیگ ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد، یہاں کی لوکل کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے اور میر کرار حسین مرحوم مختار عدالت اُس کے سکریٹری تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے مُشران صاحب سے ڈپوٹیشن کی تائید میں اسپیچ دینے کی فرمائش کی۔ میموریل فنڈ کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کالج کو بیادگار سر سید مرحوم، یونیورسٹی کے درجے پر پہونچایا جائے۔ جو اسپیچ دی گئی، درج ذیل ہے:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

سجدے کی جا ہے شکر خدا کا مقام ہے ✦ موقع ہے آج کیجیے کرنا جو کام ہے
کالج کے حامیوں کا یہاں ازدحام ہے ✦ اب حسنِ اتفاق میں کس کو کلام ہے
وہ کام ہو کہ روم سے تا شام نام ہو ✦ وہ عزم ہو کہ بخت سکندر غلام ہو

آج کا جلسہ ایک خاص نوعیت رکھتا ہے - میں نے اس شہر میں بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں - کسی میں ہندو مسلمان دونوں اس کثرت سے مجمع نہیں ہوئے - اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہندوؤں کا جلسہ ہے تو مسلمانوں کو اس کثرت سے شریک ہوتے، میں نے نہ دیکھا تھا - اگر کوئی یہ کہے کہ یہ خاص مسلمانوں کا جلسہ ہے تو یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو ایسے جلسے میں اس کثیر تعداد سے جمع ہوئے ہیں - صاحب کلکٹر بہادر کی رونق افروزی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ جلسہ سرکاری طور پر کیا گیا ہے کہ جس کے باعث اتنا مجمع ہے - اصل یہ ہے کہ سرسید مرحوم کے نام کا جادو ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے اور اُسی شہید قوم کے کارناموں کا نقش ہمارے دلوں پر سویدا کی طرح ہے، جو جذب مقناطیسی سے اس وقت ہم سب کو اس جلسے کی طرف کھینچ رہا ہے -

میرے نزدیک ہندوؤں نے جوق در جوق آکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب لیاقت یا حسن عمل کی داد دینے کا موقع آتا ہے تو وہ فیاضانہ خیالات ظاہر کرتے ہیں اور دریا دلی سے کام لیتے ہیں اور خود غرضی یا مذہب یا قومیت کا خیال چھوڑ دیتے ہیں -

یہ کہا جاتا ہے کہ دوستی کالے گورے کا امتیاز نہیں جانتی، اسی طرح قدر دانی اور شکر گزاری بھی مذہب اور قومیت کا فرق نہیں رکھتی - اگر قابلیت، قومی ہمدردی اور حسن عمل قابل قدر چیزیں ہیں تو ہر شخص کو بلا خیال مذہب و قومیت کے اس فنڈ میں شریک ہونا چاہیے - میں خود اپنی نسبت نہیں

کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کس گروہ قے اور کس جماعت کی طرف سے اپیل کر رہا ہوں - آیا ہندوؤں کی طرف سے یا مسلمانوں کی جانب سے - بہر حال میں اس وقت ایسے لوگوں کا قائم مقام ہوں جو انصاف پسند ہیں اور قومی ہمدردی اور لیاقت کی داد دینے والے ہیں اور ملک کی خیر خواہی اور گورنمنٹ کی وفاداری کی قدر کرنے والے ہیں - لیاقت کی قدر شناسی کا سبق ہم کو انگریزوں سے سیکھنا چاہیے - ابھی حال میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا ہے کہ مسٹر منموہن گھوش کی یادگار منانے کے لیے انگلستان میں چندہ کیا گیا ہے - زرا غور فرمائیے گا، کجا بنگالہ کجا انگلستان، سمندر پار ہزاروں میل کا فرق ع
بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا - مذہب و ملت اور قومیت کا فرق، اس سے بھی زیادہ گویا سیاہ اور سفید کا فرق - اس پر مستزاد، جیسا کہ کہا جاتا ہے، کہ بنگالیوں سے انگریز بہت جلتے ہیں - اس بنگالی کی یادگار منانے میں، ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ قابلیت کی قدردانی کرنے میں اور دوست کے ساتھ دوستی کا سچا برتاؤ اور اخلاص برتنے میں ہم، ذات، مذہب، قوم، جماعت کا کچھ خیال نہیں کرتے، نہ کالے گورے نہ فاتح مفتوح میں کچھ تمیز کرتے ہیں -

سر گور اُوسلی صاحب کا حال آپ نے پڑھا ہوگا، جب ۱۸۱۱ء کے شروع میں بعنوان سفارت انگلستان کی طرف سے صاحب موصوف فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں گئے، اُس وقت کچھ عرصے تک شیراز میں اُن کا قیام ہوا - وہ خود لکھتے ہیں کہ "میں وہاں اکثر شیخ سعدی کے مزار کی زیارت کیا

کرتا تھا۔ مسٹر فرینکلن سیاح نے جو سعدی کی قبر کا حال اپنے سفرنامے میں لکھا ہے میں نے وہ بچشم خود دیکھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"حقیقت میں قبر بہت بوسیدہ ہوگئی ہے اور عنقریب کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر، جو زہد و تقویٰ، ذہن و جودت اور علم وفضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔ مجھے جو حسن عقیدت، شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ تھا، اُس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے شیخ کے مقبرے کی مرمت کرا دوں، مگر حسین علی مرزا نے، جو شاہ ایران کا پانچواں بیٹا اور فارس کا گورنر تھا، مجھ سے بہت اصرار اور سرگرمی سے یہ کہا کہ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، میں خود سعدی کی قبر کی مرمت اُسی خوش اسلوبی سے کرا دوں گا جس طرح کریم خاں زند نے حافظ شیرازی کے مقبرے کی مرمت کرائی تھی، لیکن افسوس کہ اُس شہزادے نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔"

صاحبو! کیا عبرت کی جگہ ہے کہ ایک عیسائی مذہب اپنے ملک سے ہزاروں کوس نکل کر ایک اجنبی ملک میں اپنے کارِ خاص پر جاتا ہے اور وہاں سفر کی حالت میں ایک مسلمان مصنف کی یہ قدر کرتا ہے کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے اُس کے مقبرے کی مرمت کرانا چاہتا ہے، حالانکہ کوئی واسطہ مذہب یا قوم یا ملک کا اُس کے ساتھ نہیں رکھتا، اور ایک مسلمان شاہزادہ

باوجودیکہ اس مصنف کا ہم وطن، ہم مذہب اور ہم قوم ہے، یہ بے اعتنائی عمل میں لاتا ہے! انہی سر گور کے ایک چھوٹے بھائی اور اہل کمال کے قدر شناسوں کا ایک نمونہ، ہمارے میر مجلس مسٹر ڈیوہرسٹ صاحب بہادر ہیں۔ باوجودیکہ مسلمانوں یا ہندوؤں سے سوائے انسانیت کے رشتے کے، کوئی دوسرا واسطہ قوم یا مذہب یا ملک وغیرہ کا نہیں رکھتے، لیکن سرسید کی قدردانی میں آپ، اُن کے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یقیناً اسی خوشی سے چندے میں شریک ہوں گے جیسے ہم سب لوگ۔

صاحبو! جب کہ مہذب قوموں میں غیر قوموں کے ساتھ یہ قدردانی ہے، جس کی مثالیں ابھی عرض کی گئیں، تو سرسید ہمارے تو بھائی تھے۔ ہم اُن کے عمدہ کاموں کی داد دیتے ہیں، تو کیا بڑی بات ہے۔ اُس فدائے قوم نے کتنا بڑا احسان اپنی قوم پر کیا ہے کہ اُس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچا دیا ہے۔ سرسید پہلا شخص تھا جس نے یہ کہا "الاسلام ھوا لفطرۃ والفطرۃ ھی الاسلام"۔ وہ جس ملک اور جس قوم میں پیدا ہوتا اُس کے لیے باعث افتخار ہوتا۔ علی گڑھ کالج قائم کرنے سے سرسید کا منشا یہ تھا کہ ایسا کالج ہونا چاہیے جہاں معلم نہ صرف اُستاد کا تعلق شاگردوں کے ساتھ رکھیں، بلکہ اُن کے ولی اور والدین کے قائم مقام ہوں۔ ایسی تعلیم گاہ ہو کہ جہاں تعلیم نظری و عملی دونوں میسر آئیں، جہاں طلبہ آپس کی خیر خواہی اور ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سیکھیں، جہاں خویشتن داری سکھائی جائے، جس کو انگریزی میں "سیلف ریسپکٹ" کہتے ہیں۔ ایسا دارالعلم ہو جہاں طلبہ گورمنٹ کی خیر خواہی

اور وفاداری کرنا سیکھیں اور اُن نعمتوں کی قدردانی کریں جو دولت برطانیہ کی بدولت ہم کو حاصل ہیں۔ وہ یہ بات چاہتے تھے کہ قوم کا ہر فرد، نہایت صلح جو اور بکار آمد سٹیزن (متمدن) بن جائے۔ وہ دلدادۂ اسلام یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں اخوت اسلامی اور حمیت اسلامی پیدا ہو جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالج کے یہ اغراض قابل پسند نہیں۔ علی گڑھ کالج اس بات کی یادگار ہے کہ سرسید نے اپنی قوم کی خدمت یوں نمایاں طور پر کی اور اب جو متفقہ کوششوں سے اُس کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہونچائیں گے، تو وہ اس بات کی یادگار ہوگا کہ قوم نے سرسید کے احسانات کا شکریہ یوں نمایاں طور پر ادا کیا ہے۔

صاحبو! کالج کی عمارتوں کو خوب وسیع اور عالیشان کیجیے، بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ کی تعداد بڑھائیے۔ وظائف اور انعامات کثرت سے قائم کیجیے۔ غرضکہ کالج کو تعلیم کا مرکز بنا دیجیے تاکہ وہ مثل بغداد کے مدرسۂ نظامیہ یا قرطبہ کی یونیورسٹی یا غرناطہ کے دارالعلوم کے تمام اسلامی دنیا میں مشہور و معروف ہو جائے۔ عہد سلطنت عباسیہ میں مدرسۂ نظامیہ نے اور دولت بنی اُمیّہ کی بدولت تعلیم گاہ قرطبہ و غرناطہ نے وہ فروغ پایا تھا کہ اسلامی دنیا کے سوا یورپ و افریقہ کے دُور دراز ملکوں سے طالب علم وہاں پہونچا کرتے تھے اور جو شخص اُن درسگاہوں سے پڑھ کر نکلتا تھا اُس کے مستند سمجھنے میں کسی کو کلام نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ علی گڑھ کالج جب محمڈن یونیورسٹی کے درجے پر پہونچ جائے گا، تو تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہو سکتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے حق میں بڑی رحمت ثابت ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے اور مکتب جا بجا قائم

کرنے سے احتراز کیجیے، ورنہ قوت تقسیم ہو جائے گی۔ ہر شخص کو چاہیے کہ درمے، قدمے، سخنے اسی کالج کو مدد دے، تاکہ یہ بڑا کام جو آپ نے ہاتھ میں لیا ہے، انجام پا جائے۔ ورنہ چھوٹا مدرسہ چلے گا نہ بڑا کالج، دونوں بے ثبات ہو کر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ فرض کیجیے کہ آفتاب کے بہت سے ٹکڑے کر کے تمام آسمان مری پر پھیلا دیے جائیں تو کیا اُس کا یہ جاہ و جلال باقی رہے گا، اور پھر کیا وہ اپنی روشنی و تمازت سے حیوانات و نباتات کو وہی فائدہ پہونچا سکے گا جو اس وقت پہونچا رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر سو مدرسے ایسے ہوں جو ناکافی تعلیم دیتے ہوں، اُن کے مقابل میں ایک کالج اچھا جو کامل تعلیم دے سکے۔

جب سرسید نے یہ کالج قائم کرنا چاہا تھا تو اُن کے مددگاروں کی رائے یہ تھی کہ کالج کی عمارتوں میں زیادہ روپیہ نہ لگایا جائے، بلکہ وہ تعلیم کی دوسری اغراض کے لیے محفوظ رکھا جائے، مگر واہ رے سرسید! صرف وہی شخص تھا جس نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کالج کی عمارتیں کیمبرج یونیورسٹی کے نمونے پہ شاندار اور وسیع بنوائیں اور کالج کو بہت بڑا مرکز تعلیم بنا کر ایک زبردست دارالعلوم بنا دیا جو تمام ملک میں مشہور ہو کر ہندوستان کے ہر حصے سے طالب علم کھینچ لایا۔ حسن اتفاق سے سرسید کا اپنے مشیروں کی رائے سے اختلاف کرنا، مسلمانوں کے حق میں ایسا ہی رحمت کا باعث ہوا، جیسا جنگ بلاسی کے وقت جنرل کلائیو نے اپنی کونسل کی رائے پر عمل کیا ہوتا اور پلاسی کی لڑائی نہ لڑی ہوتی تو بنگالہ فتح نہ ہوا ہوتا اور سلطنت انگلشیہ کی بنیاد نہ پڑی ہوتی۔ اسی طرح اگر سرسید نے عام رائے سے اتفاق کیا ہوتا تو اس وقت یقیناً

بجائے موجودہ عظیم الشان عمارتوں کے چند جھونپڑیاں مکتب خانوں کی ہوتیں، جن میں ملّا لوگ بوریا بچھائے ہوئے لڑکوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور اہل محلّہ کی خیرات سے اُن کا گزارہ ہوا کرتا اور علی گڑھ سے باہر اُن مکتبوں کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔

صاحبو! چھوٹی اور بڑی تعلیم گاہوں کا باہم مقابلہ کیجیے۔ ایک مڈل اسکول لیجیے اور ایک ہائی اسکول۔ دونوں میں مڈل کلاس ہے، دونوں جگہ یکساں کتابیں ہیں، مگر ہائی اسکول کے مڈل کلاس کے طالب علم بمقابلہ مڈل اسکول کے مڈل کلاس کے طلبہ کے، زیادہ لائق ہوں گے۔ پھر ہائی اسکول لیجیے اور کالیجیٹ اسکول۔ دونوں میں انٹرنس کلاس اور دونوں درجوں میں یکساں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر کالیجیٹ اسکول کے انٹرنس کے طالب علم بمقابلہ ہائی اسکول کے انٹرنس کے طالب علم کے، زیادہ ہوشیار اور لائق ہوں گے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ ایک معمولی کالج ہے اور ایک یونیورسٹی کالج۔ دونوں جگہوں کے ایف، اے۔ بی، اے۔ ایم، اے کے طلبہ کا باہم مقابلہ کیجیے، تو یونیورسٹی کالج کے طلبہ کو آپ زیادہ لائق پائیں گے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنی بڑی تعلیم گاہ ہوگی اور جتنے زیادہ لائق اور بیدار مغز اُستاد ہوں گے اُتنے ہی زیادہ لائق اور روشن دماغ اور بلند خیال شاگرد ہوں گے۔ پس آپ لوگ اگر اپنے کالج کو محمڈن یونیورسٹی کے درجے تک پہونچائیں گے تو یقیناً اور بھی زیادہ عمدہ تعلیم و تربیت آپ کے کالج میں میسر آئے گی اور مسلمانوں کو تعلیمی فائدے اس وقت کے مقابلے میں بہت زیادہ پہونچیں گے۔

صاحبان والاشان! یہ کہنا غلط اور سراسر غلط ہے کہ سر سید صرف مسلمانوں کے بہی خواہ تھے اور قوموں سے اُن کو کوئی تعلق نہ تھا۔ سر سید کی تقریریں جو وائیسرائے کی کونسل میں لوکل سیلف گورنمنٹ پر اور البرٹ بل کے پُرآشوب زمانے میں ہوئی ہیں، ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شخص تمام ہندوستان کا وکیل ہوکر گفتگو کرتا تھا۔ ہمارے صوبے میں وہ پہلا شخص تھا جو ہندوستان میں پارلیمنٹ ہونے کی ضرورت انگریزوں پر ظاہر کرتا تھا۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہم چند مسائل پر اختلاف رائے تھا تو سر سید یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنا کر وہ اختلاف دور کر دیں تاکہ مسلمان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ملک کے خیر خواہ بنیں اور ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر فرقہ آج کل ملکی اور قومی ترقی کو مد نظر رکھتا ہے، لہذا آزادی کے سبب کوئی فرقہ ایک طریق کو اور کوئی گروہ دوسرے اصول کو باعث عروج سمجھتا ہے۔ بہر حال نیک نیتی سے مختلف راہیں اختیار کرنے میں مآل وہی ہے کہ ایک منزلِ مقصود پر پہونچیں۔

صاحبو! مجھے احتمال ہے کہ مبادا میری گفتگو نے طول کھینچا ہو اور یہ بھی خیال ہے کہ ہنوز عملی کارروائی چندے کی ہونا باقی ہے، لہذا میں آپ کو اب زیادہ منتظر نہ رکھوں گا اور بالآخر میں آپ لوگوں کی خدمت میں اپیل کروں گا کہ ایسے کار خیر میں شریک ہو کر داخل حسنات ہو جیے اور اُس فدائے قوم کے مانند، جس نے قومی ہمدردی کا سبق آپ کو پڑھایا ہے، اس وقت فیاضی اور دریا دلی سے کام لے کر نام نیک بلکہ ثواب دارین حاصل کیجیے۔ میں آپ کی

خدمت میں اسلام کے نام سے اپیل کرتا ہوں جس کا حامی و مددگار سرسید تھا اور جس کی شان و شوکت زمانۂ سابق میں بے نظیر تھی - آپ مسلمانوں سے اُمید ہے کہ علوم و فنون کی اشاعت اور حکمت و فلسفہ کی سرپرستی میں وہی ذوقِ علمی ظاہر کریں گے جو زمانہ متوسط میں خلفائے عباسیہ و بنی اُمیہ کے عہد میں عروج اسلام کا باعث ہوا تھا - میں تمام ہندو صاحبوں اور آریا بھائیوں کی خدمت میں یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کار نیک میں اُسی مستعدی اور فیاضی کے ساتھ شریک ہوں، جو آپ کے آباؤ اجداد اور برگزیدہ اسلاف کا مشہور طریقہ تھا - آپ لوگوں میں دیش اوپکار یعنی رفاہ ملکی اعلیٰ درجے کا عمدہ کام سمجھا جاتا ہے - اس سے زیادہ کیا اچھا کام ہوسکتا ہے کہ آپ چھ کروڑ مسلمانوں کو بے شمار تعلیمی فائدے پہونچائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ملک کی فلاح و بہبود کریں گے - آخر میں ہر قوم و ملّت اور ہر طبقہ و جماعت کی طرف سے میں آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ اس وقت، بلا خیال مذہب و قوم کے، نہایت سچّے دل سے اُس حبیب وطن کی زندہ یادگار بنانے میں شریک ہوجیے۔

ہندو مسلم اتحاد

بماہ ستمبر ۱۹۲۷ء، ایک جلسۂ عام میں، جو ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے منعقد ہوا تھا، مشران صاحب نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:-

جناب صدر و حضرات انجمن!

آپ لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ۸ ستمبر ۱۹۲۷ء کے جلسۂ عام میں، جو کہ ٹاؤن ہال میں اس غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ہندو مسلم اختلاف کی زہریلی ہوا سے فرخ آباد کو محفوظ رکھا جائے اور یہاں مزید اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، چار اشخاص کو عملی اقدامات کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، جن میں خاکسار بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں میری پہلی تجویز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں، جو جلوس نکلتے ہیں، اُن میں بجائے ایک فرقے کے، دونوں فرقے برابر کا حصہ لیں اور اس طرح یکجہت و یکدل ہو کر جلوس اٹھائیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس نہ ہو سکے کہ یہ ہندوؤں کا جلوس ہے یا مسلمانوں کا۔

فی الحال رام لیلا کا جلوس نکلنے والا ہے۔ اس موقع پر ہم کو ایسی یگانگت کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے کہ معمولی انتظامات جو پولیس کیا کرتی ہے، اُن کے علاوہ حکام کو کسی قسم کی مداخلت کی گنجایش باقی نہ رہے اور وہ بھی ہمارے مہذب و متمدن قوم ہونے کا اعتراف کر لیں۔

بھائیو! گو کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان نہیں ہوں،

مگر میرے دل میں دونوں فرقوں کے لیے ایک سی جگہ ہے اور میں دونوں کو صرف "ہندوستانی" ہونے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اپنے آپ کو دونوں جماعتوں کا نمایندہ سمجھتا ہوں اور مجکو یہاں دونوں کی نمایندگی کا حق حاصل ہے۔ میں اوّل ہندؤوں کی نمایندگی کے طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ یہاں (ہمارے شہر میں) ہنود کی اکثریت ہے اور وہ کسی دوسرے گروہ کی معاونت کے محتاج نہیں، مگر باایںہمہ وہ تنہا بغیر اپنے پڑوسی کی شرکت کے، کوئی کام کرنا نہیں چاہتے اور مسلم بھائیوں کو اپنا برابر کا شریک، بلکہ شریک غالب بنانا چاہتے ہیں۔ ہندؤوں کی محبت و مروت، جو مسلم بھائیوں کے ساتھ ہے، وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے۔ اگلے زمانے کو چھوڑیے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ خلافت ایجی ٹیشن کے زمانے میں ہندو، مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر "اللہ اکبر" کے نعرے لگا چکے ہیں، جو کہ خالص اسلامی نعرہ ہے۔ مہاتما گاندھی اس ایجی ٹیشن کے قائد اعظم تھے۔ ہندؤوں کی یہ رواداری اور مواسات و غمخواری اس بات کا کھُلا ہوا ثبوت ہے کہ ان کا دل کس قدر کشادہ، حوصلہ کتنا بلند اور ظرف کس درجہ عالی ہے۔

اب میں مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ مسلم بھائی بھی ہندؤوں کی اس یگانگت و ہمدردی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ شکر گزار قوم ہیں، حق پسند ہیں، ان کی رگ رگ میں محمدؐ عربی کے اخلاق کی روح دوڑ رہی ہے، وہ معاشرت و تمدن میں اپنے نبیؐ برحق کی ہدایات کا قدم قدم پر لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ نبیؐ برحق، جس کی بزم میں یہود، نصاریٰ اور بت پرست سبھی آتے تھے اور

مسلمانوں کے شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے تھے۔ اپنے پرائے کا امتیاز بالکل نہ تھا، بلکہ بسا اوقات حضرت محمدؐ ان یہود و نصاریٰ کے لیے اپنی عبائے مبارک کا فرش بچھا دیتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر رواداری کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ، جھوٹ موٹ کسی ذاتی مفاد کی غرض سے، آنحضرت کی بزم میں آکر شریک ہوتے تھے اور دھوکا دینے کے لیے مسلمان بن گئے تھے، جن کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے اور پورا سورۂ مُنافقون انہی کے بارے میں موجود ہے، رسول صلعم ان کو جانتے اور پہچانتے تھے، مگر آپ نے صرف اپنی وسعت اخلاق سے مرتے دم تک اپنے صحابہ کو ان لوگوں کے نام و نشان سے آگاہ نہیں کیا۔ میں آج کل سیرتِ نبوی پڑھ رہا ہوں، جو سر ولیم میور نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ اس میں جا بجا رسول مقبولؐ کے اخلاق کا ذکر ہے، جس کو پڑھ کر، میں بہت خوش ہوا۔ اُن کی مروّت، غمخواری، ہمدردی اور فیاضی فقط دوستوں کے ساتھ نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی بیان کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ اُن کی طبیعت میں بہت پُرشور جذبات تھے، مگر نفس کشی سے وہ اپنے غصّے کو ایسا فرو کرتے تھے کہ یہ جذبات اوپر کی سطح پر نمایاں نہیں ہونے پاتے تھے۔ پس ایسے خلیق نبیؐ کی امت سے سوائے خوش خلقی اور رواداری کے کبھی ہرگز کسی دوسرے سلوک کی امید نہیں کی جا سکتی۔

ہندو مسلم، ہر دو فریق کی رواداری کے جو مظاہرے، ہمارے فرخ آباد میں ہوتے رہتے ہیں، ان پر نظر کرکے ہم کو اس وسوسۂ باطل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہاں کسی قسم کی کشمکش، کبھی پیدا ہوگی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ

اب سے پندرہ سال قبل محرم الحرام اور رام لیلا ایک ہی وقت میں پڑے تھے اور اتفاق سے امام حسینؑ کے سیوم اور بھرت ملاپ کا دن ایک تھا۔ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے جذباتِ غم کا احترام کرکے، اپنی طرف سے بغیر کسی تحریک کے مسلمان لیڈروں کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اوّل ہم آپ کے یہاں، امام کے تیجے میں شریک ہوں گے، بعدازاں بھرت ملاپ کی رسم ادا کریں گے۔ یہ ہے یہاں کے ہندوؤں کی رواداری۔ اب مسلمانوں کی کیفیت سنیے۔ محرم کے دس دن، سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں سوگ اور ماتمداری ہوتی ہے اور اُن کے گھروں میں، بلکہ دلوں میں بھی، خوشی کے اسباب و لوازم کا گزر نہیں ہوتا، مگر بھرت ملاپ کے مراسم میں علی العموم مسلمانوں نے شرکت کی اور جان و دل سے حصّہ لیا۔ یہ بات تو ہمارے شہر میں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے کہ یہاں کے ہندو، محرم میں جا بجا سبیلیں رکھتے ہیں اور شربت پلاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ہولی وغیرہ میں ہندو احباب کی تواضع عطر، الائچی اور سگریٹ وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہ باہمی سلوک، یہاں عام ہے۔ کسی خاص طبقے سے خصوصیت نہیں رکھتا ـــــ میں اس موقع پر اپنے مسلمان بھائیوں کو نیز ہندوؤں کو شاہ افغانستان کا ایک قول، جو میں نے اخبار میں پڑھا ہے، سُنانا چاہتا ہوں، جس کو سُن کر آپ بہت خوش ہوں گے۔

شاہ موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندو مسلم، میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں"

حضرات! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے ضلع کے اور تمام ہندوستان کے

ہندو اور مسلمان، شاہ ممدوح کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اُن کی توقعات سے زیادہ ثابت کر دکھائیں گے اور جو قوت در پردہ اختلاف پیدا کرنے کی حامی ہے، اُس پر واضح کر دیں گے کہ ہندوستان، ایک جسم ہے اور ہم اس کی داہنی، بائیں، آنکھیں ہیں۔ ہم میں کسی قسم کا اختلاف ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔

صاحبان ذیشان! اس وقت چونکہ اختلاف کا منحوس لفظ میری زبان پر آگیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی چند کلمات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ دو پڑوسیوں میں اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا، البتہ اُس صورت میں کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں خود غرضی کو دخل دے۔ پڑوسیوں کا تو کیا ذکر ہے، اس خود غرضی کی وجہ سے تو بھائی، بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ پس یہ اختلافات جو فرقہ وارانہ، جا بجا ہوتے رہتے ہیں اسی قسم کی خود غرضیوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن کی ہوس میں، دنیا کے حریص و طماع اپنے سگے بھائی کی خونریزی میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی　　بیچ ہی ڈالیں جو یوسفؑ سا برادر پائیں

غرض اس بحث سے یہ ہے کہ ان نزاعات و فسادات کا باعث، مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی صاحب، ہندو یا مسلمان، بتائیں کہ ان دونوں میں سے کسی کا مذہب یا دھرم یہ حکم دیتا ہے کہ تم کسی وقت اور کسی حال میں بھی، بنی نوع انسان کا خون بہاؤ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دفاع کے لیے ہر مذہب نے اجازت دی ہے اور اس میں جو خون بہہ جائے، وہ روا بھی ہوتا ہے، مگر خود سے بہیمانہ طور پر حملہ کر دینے کو کوئی مذہب گوارا نہیں کرتا۔ بہر صورت جہاں جہاں، اس قسم کے

جھگڑے آپس میں ہو گئے ہیں یا خدانخواستہ آیندہ ہوں، وہاں کے لوگوں کو مصالحت کی طرف آنا چاہیے اور مصالحت کے وقت ایک گُر یاد رکھنا چاہیے کہ دائمی اور پائدار صُلح اُسی وقت ہوتی ہے، جبکہ متخاصمین کو مساوات کے حقوق مِل جائیں۔ پس اگر کسی فرقے کے لیڈر، اپنی اکثریت کی بنا پر، مساوات کے حقوق دوسرے فرقے کو نہ دیں تو یہ اُن کی نادانی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مِل جُل کر رہنا نہیں چاہتے۔ مساوات بہترین چیز ہے۔ اگر ایک فریق نے اکثریت کے زعم میں دباکر صُلح کرنا چاہی تو اوّل تو یہ صُلح ہونا ہی ناممکن ہے اور اگر کسی مصلحت یا مجبوری سے دوسرے فریق نے دب کر صلح کرلی تو وہ دیرپا نہیں ہو گی اور بات بات پر ٹوٹتی رہے گی اور دونوں فریق میں محبت کبھی نہ پیدا ہو سکے گی۔ یاد رکھیے کہ محبت کا اصول ہی برابری ہے۔ ایک بہت بڑا ہے اور دوسرا بہت چھوٹا، تو ان دونوں میں دلی محبت نہیں ہو سکتی۔ سچی اور مستقل محبت اُنہی دو شخصوں یا گروہوں میں ہو سکتی ہے جو باہم برابری رکھتے ہوں یا اُن دونوں میں یہ بات قرار پا جائے کہ ہم ہمیشہ برابری کا برتاؤ کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ اگر آپ اس اصول کو ملحوظ رکھیں گے، تو کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔

حاضرینِ مشاعرہ کا خیر مقدم

آداب شاعری اور حالات شعراء

۲۸ر اپریل سنہ ۲ء کو ایک بزم مشاعرہ بمقام مدرسہ مفتی صاحب قرار دی گئی تھی۔ جس میں چند اضلاع کے شعراء شریک ہوئے تھے اور میر مجلس ایک رئیس مین پوری تھے۔ مشران صاحب کو استقبالیہ کمیٹی کی صدارت تفویض کی گئی تھی اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ شکریے کی تقریر کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے موضوع پر بھی کچھ بیان ایسا کیا جائے جو شعراء کے لیے بکارآمد اور اُن کی دلچسپی کا باعث ہو۔ موصوف نے احباب کے اصرار پر انکار مناسب نہ سمجھا اور حاضرین کا خیر مقدم کرنے کے بعد آداب شاعری اور حالات شعراء بیان کیے اور شعرائے ہند و عجم کے کلام کی مخصوص خوبیاں پیش کیں۔ خطبۂ صدارت درج ذیل ہے۔ یہ تقریر ایک گھنٹے سے کچھ زائد عرصے میں ختم ہوئی تھی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بحیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی، آپ سب حضرات کی سپاس گزاری کروں، جنھوں نے اپنے قدوم سے اس بزم سخن کو زیب و زینت بخشی ہے۔ مجھ سے میرے دوستوں نے جب صدارت کی

درخواست کی تو مجھے بہت تامل ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کام کے لیے میں موزوں نہیں ہوں ؎

صدارت بجاہ است و منزل بقدر
نہ ہر کس سزاوار باشد بصدر

مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور بزم مشاعرہ میں نثاری معمول کے خلاف معلوم ہوتی ہے لیکن میرے دوستوں نے اصرار کیا اور فرمایا کہ تمھاری نثر میں نظم بھی ہوتی ہے اور شعر و سخن کے موضوع پر بھی تم ضرور کچھ کہو تا کہ شعراء کو دلچسپی ہو اور صحبت مشاعرہ بکار آمد ہو۔ مجھ کو بجز منظور کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا بفحوائے "المامور معذور" آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں کمیٹی کی طرف سے آپ سب مہمانان عظیم الشان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی تشریف آوری سے ہم کو فخر حاصل ہوا ہے۔ جو صاحبان غیر اضلاع سے تشریف لائے ہیں وہ ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم اپنے مہمانوں کی شان کے لائق آسائش و مہمانداری کا انتظام کرنے سے قاصر رہے ہیں، اس کی ایک وجہ تو ضیق وقت ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو لوگ زیادہ کام کرنے والے ہیں وہ اتفاق سے اس وقت اپنے مشاغل کو چھوڑ نہ سکے۔ تاہم ہم نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع آپ سب مہمانان ذیشان کی خدمت گزاری کر سکیں اور ہم کو پوری اُمید ہے کہ حالات موجودہ پر نظر کر کے آپ سب حضرات ہماری فروگزاشتوں کو معاف فرمائیں گے۔

شعر و شاعری کی عظمت

اب میں دوستوں کی فرمائش کی تعمیل میں شعر و سخن کا ذکر کروں گا۔ واضح ہو کہ زمانۂ قدیم سے اب تک

شعر کی عظمت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ عرب میں یہ حالت تھی کہ شاعر کسی قبیلے میں پیدا ہوتا تھا تو جا بجا سے سفارتیں آتی تھیں جو اُس کو مبارکباد دیتی تھیں اور تمام خاندان میں بڑی خوشی منائی جاتی تھی اور تمام قبیلہ معزز سمجھا جاتا تھا اور اُس قبیلے کی عورتیں جمع ہو کر فخریہ گیت گاتی تھیں اور خوشی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ شاعر کا اقتدار ایسا بڑھا ہوا تھا کہ جس کو چاہتا تعریف کر کے آسمان کا تارہ بنا دیتا اور جس کو چاہتا ہجو کے ذریعے عرش سے فرش پر گرا دیتا ؎

یکے را زمہ اندر آرد بچاہ	دگر را ز چہ بر فرازد بماہ

ایک شخص گمنام تھا۔ اُس کی تین بیٹیاں تھیں جن کو بر نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک شاعر اُس کے یہاں آکر مہمان ہوا۔ جب شراب کا دَور چلا، تو شاعر نے میزبان کے اہل و عیال کا حال پوچھا۔ اُس نے کہا کہ میری تین بیٹیاں ہیں اور جوان ہو گئی ہیں۔ کہیں سے اب تک شادی کا پیام نہیں آیا ہے۔ شاعر بولا خاطر جمع رہو، میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ جب عکاظ کے میلے کے دن آئے تو اُس شاعر نے مجمع عام میں ایک قصیدہ پڑھا، جس میں اُس میزبان کے خاندان کی تعریف تھی۔ قصیدہ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اُس کے میزبان کے گرداگرد لوگ جمع ہو گئے اور تینوں لڑکیاں معزز خاندانوں میں پہونچ گئیں۔

ایک شاعر کو کسی معزز قبیلے سے رنج پہونچا۔ اُس نے اُس کے آباؤ اجداد کی ہجو کی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُس قبیلے کی ذلت اس قدر بڑھی کہ وہ نہایت گمنام ہو گیا اور اوج کمال سے پستی زوال میں گرا۔ یہاں تک کہ

نام و نشان بھی مٹ گیا۔

عجم میں بھی یہی حال تھا۔ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو کہی۔ سب جانتے ہیں کہ محمود کس سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا۔ اُس نے منادی کرادی تھی کہ ہجو جس کسی کے یہاں نکلے گی وہ سزا پائے گا۔ لیکن ہجو کے اشعار بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ نو سو برس سے اس وقت تک جس قدر نسخے شاہنامے کے دنیا میں شائع ہوے ہجو سے کوئی خالی نہیں۔ گویا ہجو شاہنامے کا جزوِ لاینفک ہوگئی ہے اور ہمیشہ رہے گی، بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا   بماند ہجا تا قیامت بجا

ہندوستان میں بھی شعراء کی بڑی وقعت تھی اور ہے۔ سیکڑوں شاعروں نے لاکھوں روپیے انعام میں پائے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ خسرو دہلوی نے فیل بار سونا انعام میں پایا۔ ایک مرتبہ محمد تغلق کے دربار میں مولانا جمال الدین پایۂ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پڑھا، جس کا مطلع یہ تھا ؎

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہاناں را   محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطاں را

بادشاہ نے سُن کر کہا کہ بس مولانا میری مجال نہیں ہے کہ ایک شعر سے زیادہ کا صلہ میں دے سکوں۔ یہ کہکر خزانچی کو حکم دیا کہ روپیوں کی تھیلیاں شاعر کے گرد و پیش لگادی جائیں، یہاں تک کہ شاعر کے سر تک پہونچ جائیں۔ چنانچہ اُسی وقت تھیلیاں گرد و پیش لگادی گئیں۔ جب شاعر کے سر تک پہونچیں مولانا کھڑے ہوگئے۔ یہ ادا بادشاہ کو بہت پسند آئی حکم دیا کہ شاعر کو کھڑا رہنے دو اور تھیلیاں اُس کے سر تک لگادو۔ غرضکہ ایک ہی شعر کے صلے میں شاعر

تین پشت تک مالدار ہوگیا - جب فتح علی شاہ قاچار والی ایران نے روس کے مقابلے میں فتح پائی تو قاآنی نے قصیدہ تہنیت کا پیش کیا - قاآنی اُس وقت دربار کا ملک الشعراء تھا اور ختم الشعراء اُس کا لقب تھا - جب پڑھتے پڑھتے اس شعر پر پہونچا ؎

آں قدر نصرانیاں راکشت در روزِ نبرد　　　عیسیٰ دوراں بہ گردوں دست پیغمبر گرفت

تو بادشاہ نے فقط اس ایک شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا - یہی حال ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ والیان بیجاپور کی قدردانی کا تھا کہ ملا نورالدین ظہوری کی اس قدر قدر و منزلت کی کہ اُس نے کبھی دربار مغلیہ کی طرف رخ نہیں کیا - عرفی کو دیکھیے کہ اُس نے ابوالفتح گیلانی اور خانخاناں کے سوا امرائے دربار میں سے کسی کی آستاں بوسی نہیں کی - ان دونوں قدردانان شعر و سخن کے دربار دُربار سے عُرفی عمر بھر فیض پاتا رہا - سلاطین مغلیہ کے وقت میں ایران کے بڑے شعراء اپنا وطن مالوف چھوڑ کے ہندوستان کھنچے ہوے چلے آئے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانے کو اپنا قبلۂ حاجت قرار دیا اور سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب و زینت سمجھتے رہے -

صاحبو! میں نے شعر و شاعری کی عظمت اور قدر و منزلت آپ کی خدمت میں عرض کی - اب میں شعر کی حقیقت مختصراً عرض کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں، وہ بیان کروں گا -

شعر کی ماہیت اور حقیقت

اس موضوع پر سب سے پہلے ارسطو نے کتاب لکھی، جس کا نام بوطیقا ہے - وہ کہتا ہے

کہ شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی کا نام ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مصور مادی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر جب کسی چیز کا بیان اس طور پہ کیا جائے کہ ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ ارسطو کی اس تصنیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشیق نے جو بہت بڑا فلسفی گزرا ہے اُس کا خلاصہ کیا۔ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا، اس لیے شاعری کی نسبت جو خیالات ارسطو کے تھے وہ مسلمانوں میں پھیل نہ سکے۔

ادب کی کتابوں میں جو تعریفِ شعر کی گئی ہے وہی خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہے۔ یعنی یہ کہ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو۔ جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی جملہ کہے جو اتفاق سے بطور نظم بھی کہا جاسکے تو اُس پر مصرع کا اطلاق نہ ہوگا اور وہ شعر کا جزو نہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً کوئی کہے کہ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے" یہ موزوں بھی ہو سکتا ہے۔ تین الفاظ آرسی، کیا، ہے، اگر بڑھا کر پڑھے جائیں تو پورا مصرع موزوں ہو جائے گا۔ اگر گھٹا کر پڑھے جائیں تو نثر ہے۔ مگر یہ عامیانہ تعریف ہے۔ شاعری صرف وزن اور قافیے کا نام نہیں ہے۔

ایران کے شاعروں کے نزدیک شاعری در اصل تخیل کا نام تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے جو بہت بڑا شاعر گزرا اپنی کتاب چہار مقالہ میں شاعری کی تعریف جو لکھی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ کسی مضمون کو

خیال میں ایسا ترتیب دیا جائے کہ اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت ہو جائے، جس سے محبت اور غصّے کی طاقتیں بھڑک اُٹھیں۔ یہ تو ایشیا کے پُرانے قول اور خیالات شعر اور شاعری کی نسبت تھے۔ یورپ والوں نے بہت باریک بحثیں کی ہیں۔ اور عجیب و غریب نکتے پیدا کیے ہیں۔

جان اسٹوارٹ مِل نے ایک مطول مضمون لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن سے انسانی جذبات کو کچھ تعلق نہیں۔ مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی سوال حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا خوشی یا رنج پیدا نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی کی مصیبت و تکلیف کا حال درد بھرے لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس سے ہم پر اثر ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کو جذبات یا احساسات کہتے ہیں اور جو چیز ان کو بھڑکاتی ہے اُس کا نام شاعری ہے۔ اس تعریف کی بنا پر تصویر، تقریر اور وعظ وغیرہ بھی بعض لوگوں کے نزدیک شاعری میں داخل ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسانی جذبات کو بھڑکاتی ہیں۔ لیکن مِل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں یعنی تصویر وغیرہ شاعری کے دائرے سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو کام کرتا ہے اُس کی غرض کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر اثر ڈالے، جیسے بذریعہ لکچر اسپیچ وغیرہ کے۔ کبھی وہ رنج یا خوشی کے موقع پر خود اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے، مثلاً کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو جو بھی الفاظ، زبان سے نکلیں گے اُن سے یہ غرض نہ ہوگی کہ وہ کس شخص یا جماعت سے خطاب کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔ فرض کیا جائے کہ وہاں

کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی اُس کی زبان سے وہی الفاظ نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے۔ اس بنیاد پر شاعری کی منطقی تعریف یہ ہوگی کہ جو کلام اس قسم کا ہو کہ اُس سے انسانی جذبات بھڑک اُٹھیں اور اُس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود ہی اپنا مخاطب ہو تو اُس کا نام شاعری ہے۔ مل صاحب نے اگرچہ بہت باریک بات کہی ہے لیکن شاعری کا دائرہ اُس سے بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا کہ مل صاحب کرنا چاہتے ہیں، نہ اس قدر وسیع ہے جیسا کہ ایشیا کے عالموں نے کیا ہے۔ شعر کی اصلی حقیقت یہ ہے جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ وہ ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصوّر صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات اور جذبات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس چیز کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ مثلاً دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزے کی لہک، پھولوں کی مہک، شبنم کی جھلک، ہوا کے جھونکے، دھوپ کی حدت، گرمی کی شدّت، جاڑے کی فسردگی، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، خوشی، غصہ، محبت، افسوس، حسرت، ان چیزوں کا بیان اس طرح کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یہی شاعری ہے۔ شاعری کی تعریف اور ایک طرح بھی کی جا سکتی ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں خواہ وہ مادّی ہوں جیسے پہاڑ، دریا، جنگل، باغ وغیرہ یا وہ

غیر مادی ہوں مثلاً تعریف، نفرت، محبت، غصّہ، امید، ناامیدی، رنج، خوشی۔ ان سب کا دل پر اثر پڑتا ہے، لیکن یہ اثر کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ بعض پر کم بعض پر زیادہ۔ پس جو شخص ان قدرتی چیزوں اور کیفیتوں سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اثر قبول کرے اور اپنے الفاظ سے دوسروں پر بھی زیادہ اثر ڈال سکے، وہی شاعر ہے۔ مولوی حمید الدین نے فن بلاغت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں شعر کی حقیقت یوں بیان کی ہے کہ شاعر کے لفظی معنی ہیں صاحب شعور۔ شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں جس کو انگریزی میں فیلنگ کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ ہے جس کا احساس تیز ہو۔ انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی رہتی ہیں جیسے رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا وغیرہ۔ یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکتیں صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ انگڑائی کے وقت بدن تن جاتا ہے۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصّے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے۔ ان خیالات سے سامعین کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا اور معلوم ہوا ہوگا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اُس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ تو شعر کی تعریف عرض کی گئی۔ اب شعر کے اجزاء اور عناصر کا حال سُنیے۔

شعر کے دو اجزاء ہیں۔ مادہ اور صورت۔ مادّے سے غرض ہے مضمون۔ یعنی کیا کیا بیان کیا جائے۔ صورت سے غرض یہ ہے کہ طرز ادا کیا ہو۔ شاعری کے

اصلی عناصر دو ہیں - محاکات اور تخئیل - باقی سلاست اور بندش اور عمدہ ترکیبیں اور صنائع بدائع زیب و زینت اور نقش و نگار کا کام دیتے ہیں - انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے خوشی، رنج، غصہ، آرزو، تعجب، فخر وغیرہ اُن کا ادا کرنا یا مناظر قدرت مثلاً باغ، جنگل، پہاڑ، بہار، خزاں، صبح، شام، ان کی تصویر کھینچنا شاعری کے اصلی عناصر ہیں -

محاکات کی تعریف یہ ہے کہ شاعر کسی چیز کا بیان ایسا کرے کہ جو اثر اُس کی طبیعت میں ہو، وہی دوسروں کی طبیعت میں پیدا کر دے یا یہ کہ اُس چیز کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے - تخئیل اُس قوت کو کہتے ہیں جس سے ایجاد و اختراع کا کام لیا جائے یا کوئی مسئلہ فلسفے کا حل کیا جائے - یا اگر کوئی شئے ہمارے عالمِ خیال میں ہو اُس کو ہماری نظر کے سامنے لے آئے - یہی قوت تخئیل شاعری میں مضامین بلند پیدا کرتی ہے - محاکات کا دوسرا نام مرقع نگاری ہے - مثنوی لکھنے میں مرقع نگاری سے کام زیادہ لیا جاتا ہے، کیونکہ اُس میں مسلسل واقعات کا بیان ہوتا ہے اور استعارہ اور صنائع بدائع محاکات میں خلل انداز ہوتے ہیں - بخلاف غزل یا قصیدے کے کہ اُس کا ہر شعر جدا جدا مضمون رکھتا ہے اور استعارہ یا صنائع بدائع کے استعمال کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے - فردوسی نے شاہنامے میں اعلیٰ درجے کی مرقع نگاری کی ہے - وہ واقعات کا بیان نہایت سادہ کرتا ہے اور استعارے کے پاس کبھی نہیں پھٹکتا - بخلاف اس کے نظامی نے مثنوی (سکندر نامہ) میں مرصع نگاری سے زیادہ کام لیا تو واقعات کی تصویر کھینچنے سے قاصر رہے ہیں - ایک مثال کے

ذریعہ کمند اندازی کا واقعہ دونوں شاعروں کا دکھاتا ہوں ۔ نظامی فرماتے ہیں ؎

کمند عدو بند را شہریار　　　　بینداخت چوں چنبر روزگار

کمند کے ساتھ 'عدو بند'، کے الفاظ بہت خوب ہیں ۔ بندش چسپت ہوگئی ۔ چنبر روزگار بھی خوب استعارہ ہے ۔ لیکن غور کیجیے قباحت یہ ہوگئی کہ سننے والے کی توجہ 'کمند عدو بند'، اور 'چنبر روزگار'، کی طرف زیادہ تر مصروف رہی، کمند پھینکنے کا واقعہ نظر سے بالکل چھپ گیا ۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کمند پھینکنے کا نتیجہ کیا ہوا ۔ کوئی اس میں پھنسا یا نہیں ۔ بخلاف اِس کے، فردوسی جو رزم کا دھنی ہے کہتا ہے ؎

چو از دست رستم رہا شد کمند　　　　سر شہریار اندر آمد بہ بند
زپیل اندر آوردو زد بر زمیں　　　　بہ بستند بازوئے خاقان چیں

فردوسی نے چار مصرع کہے ہیں اور ہر مصرع میں ایک مضمون علاحدہ ہے جو اُس مصرع میں پورا پورا ادا ہوگیا ۔ پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ رستم نے کمند پھینکی ۔ دوسرے میں بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کا سر پھنس گیا ۔ تیسرے میں بتاتا ہے کہ جھٹکا دے کر ہاتھی سے اُس کو نیچے گرالیا ۔ اور چوتھے میں کہتا ہے کہ پھر مُشکیں کس لیں ۔ ہر مصرع میں ایک واقعہ پورا بیان کر دیا ۔ اس کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ واقعات کی تدریجی رفتار دکھادی ۔ پہلے کمند ڈالی گئی ۔ اُس کے بعد گردن پھنسی ۔ اُس کے بعد ہاتھی سے نیچے گرایا گیا ۔ آخر میں مُشکیں کسی گئیں ۔ اگر اس سلسلے اور ترتیب میں فرق آتا تو اُسی قدر مرقع نگاری کا معیار گھٹ جاتا ۔ اسی طرح تیر اندازی کا واقعہ بیان کرنے میں فردوسی نے جو مرقع نگاری کی ہے وہ لاجواب ہے ۔ کوئی شاعر نہ کر سکا ۔ کہتا ہے ؎

تہمتن بہ بند کمر بُرد چنگ　　گزیں کرد یک چوبہ تیر خدنگ

خدنگے برآورد پیکاں چو آب　　نہادہ بر و چار پرّ عقاب

بمالید چاچی کماں را بدست　　بہ چرم گوزن اندر آورد شست

ستوں کرد چپ را و خم کرد راست

خروش از خم چرخ چاچی بخاست

ان اشعار کی خوبی بیان کی محتاج نہیں ۔ فطرت کے قاعدے سے جو واقعات یکے بعد دیگرے ہونا چاہیے ، اُسی طرح اُن کا بیان کیا گیا ہے ۔ یعنی پہلے رستم کمر کی طرف ہاتھ لے گیا کہ ترکش سے تیر نکالے ۔ پھر اُس نے ترکش میں ہاتھ ڈال کر تیر کا انتخاب کیا کہ حسب موقع تیر نکالوں ۔ اُس کے بعد تیر چُن کر نکالا ۔ کیونکہ تیر کی بھی اقسام ہوتی ہیں ۔ اب شاعر کا فرض تھا کہ دکھائے کہ وہ تیر کس شکل کا تھا ۔ بتاتا ہے کہ اُس کی نوک نہایت تیز اور آبدار تھی اور سوفار میں چار پر عقاب لگے ہوے تھے ۔ پھر کمان ہاتھ میں لی ۔ اُس کے بعد شست باندھی ۔ کمان کھینچنے اور شست باندھنے میں جو مخصوص حالت ہوتی ہے یعنی یہ کہ بایاں ہاتھ سیدھا کیا جاتا ہے اور داہنے ہاتھ کو خم کیا جاتا ہے ، بعینہ وہی تصویر چوتھے شعر میں کھینچ دی ۔ کمان تنومند آدمی کھینچتا ہے تو کمان چرچراتی ہے ۔ یہ سب جزئیات بیان کیے گئے ہیں جن سے واقعہ نظر کے سامنے آگیا ہے ۔ چوتھا شعر محاسن شعری کے لحاظ سے لاجواب ہے ۔ چپ و راست ، ستوں کردن ، چرخ چاچی ، یہ الفاظ اور اصطلاحات اور اس پر بندش کی چستی اور صفائی ، یہ خوبیاں مذاق سلیم رکھنے والے سمجھتے ہیں ۔ آج تک کسی شاعر نے تیر کھینچنے کی مخصوص حالت اس حسن و خوبی سے بیان

نہیں کی۔ صرف مصرع اول میں تصویر کھینچی ہے اور دوسرے مصرع میں دوسرا واقعہ جو مصرع اول کا نتیجہ ہے بیان کر دیا ہے۔ یعنی کمان کا چرچرانا۔ فردوسی نے تیر مارنے کے اس قدر جزئیات بیان کیے کہ نو شعر کے بعد کہا کہ دشمن تیر کھا کر ہلاک ہوا۔ دوسرا کوئی شاعر اس واقعے کو لکھتا تو ایک یا دو شعر میں ختم کر دیتا۔ کیونکہ وہ جزئیات میں نہیں جا سکتا تھا۔ جزئیات میں جانا قادر الکلامی پر دلیل ہے۔ انہی اشعار میں دو شعر اور آپ کے سننے کے قابل ہیں ؎

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس — سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ — ملک گفت احسن فلک گفت زہ

جب ہم شکار کھیلنے جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ اکثر دوست احباب اور نوکر چاکر بھی ہوتے ہیں اور اِدھر اُدھر گاؤں کے لڑکے شکار کھانے یا سیر و تفریح کی غرض سے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ جب ہمارے نشانے سے شکار گرتا ہے تو دوست اپنی شائستہ زبان میں داد دیتے ہیں کہ واہ کیا نشانہ لگا ہے۔ سبحان اللہ، واہ واہ، کیا کہنا! لیکن دیہاتی دوسری طرح داد دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مارا، وہ گرا، جانے نہ پائے، بھاگنے نہ پائے، پکڑو وغیرہ۔ شاعر نے دونوں طرح کی داد تیر انداز کی بیان کی ہے۔ یعنی آسمان نے اُس کے ہاتھ چوم لیے، پھر آسمان اور فرشتوں نے احسنت و مرحبا کہا۔ لیکن قضا نے کہا کہ پکڑ لو جانے نہ پائے۔

مصوّر مادّی چیزوں کی تصویر خوب دکھا سکتا ہے بلکہ بعض جذبات کو بھی بذریعہ تصویر نظر کے سامنے لا سکتا ہے، مثلاً ہنسی خوشی، غم، رونا، تعجب، مایوسی، غصّہ، دیوانگی وغیرہ اور شاعر کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

شاعر جن یا دیو کی تعریف میں کہتا ہے ؎

دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے ... دانت اُس کے ستھے گورکن قضا کے

برگد کی جٹائیں بال اُس کے ... زنبور سیاہ خال اُس کے

اگر کوئی اچھا مصوّر دیو یا جن کی تصویر کھینچنے میں اُس کے دانت اور بال اور خال ایسے ہی دکھائے جیسے کہ الفاظ کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں تو یقیناً اُس تصویر کو دیکھ کر ہم زیادہ حظ اُٹھائیں گے ۔ یا شاعر کہتا ہے ع

شتر لب غول منظر خوک دنداں خرس پیشانی

اگر مصور لب اور دانت اور پیشانی اسی طرح دکھا دے جیسی بذریعہ الفاظ بیان کی گئی ہے تو یقیناً زیادہ لطف آئے گا ۔ لیکن بشیتر گوناگوں ، واقعات ، واردات اور حالات ایسے ہوتے ہیں جن کو دکھانے سے مصوّر قاصر ہے اور شاعر ہی بذریعہ الفاظ دکھا سکتا ہے اور اُن کا بیان کرنے میں پورا کامیاب ہو سکتا ہے ۔

مثلاً نظامی کہتا ہے ؎

نسب نامۂ دولتِ کیقباد ... ورق بر ورق ہر سوے برد باد

شاعر کو یہ دکھانا منظور ہے کہ دارا کے مرنے سے تمام خاندان کیانی کا خاتمہ ہو گیا اور نسل کیانی برباد ہو گئی اور اُس کا شیرازہ بکھر گیا ۔ شاعر عالم خیال میں یہ بات دیکھ رہا ہے اور دکھانا چاہتا ہے ۔ اس عالم خیال کی تصویر مصوّر کی طاقت سے باہر ہے ۔

صاحبو! میں شعرائے عجم و عرب کے کلام سے مثالیں لا رہا ہوں ۔ مجھے چاہئے کہ فردوسی ہند حضرت انیسؔ کے کلام بلاغت نظام سے مرقع نگاری اور محاکات کی

مثالیں عرض کروں ۔ کہتے ہیں :-

دو دن سے بیزباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو، شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا مُنہ سوار کا

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت عباسؑ علمبردار نہر فرات سے پانی لینے گئے ہیں ۔ چونکہ اہل بیتؑ کئی روز سے پیاسے تھے، گھوڑا بھی دو روز سے پیاسا ہے ۔ اُنھوں نے اپنی مشک پانی سے بھر لی ہے تاکہ پانی لاکر اہل بیتؑ کو دیں ۔ خود پانی نہیں پیتے ہیں اور نہ گھوڑے کو پلاتے ہیں ۔ گھوڑے نے حالتِ تشنگی میں نہر کو دیکھا تو اپنی فطرت کے مطابق ہنہنانے لگا ۔ وہ اپنے شہسوار کے ارادے سے واقف ہے کہ مجھے وہ پانی نہ پینے دے گا ۔ گھوڑا عربی النسل مالک کا اطاعت شعار و وفادار ہے ۔ لیکن ایک طرف تو اُس کو پیاس بے چین کر رہی ہے دوسری طرف آقا اُس کو روک رہا ہے تو اُس بیچارے بے زبان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ بار بار کانپتا ہے اور اُس کا بند بند سمٹ رہا ہے ۔ پیاس کی حالت میں جو حالت گھوڑوں پر طاری ہوتی ہے، اُس کا فطری منظر دکھایا ہے ۔

واضح ہو کہ محاکات یا مرقع نگاری بجائے خود ایک لطف انگیز چیز ہے ۔ یعنی کسی چیز کا بیان ایسا کرنا کہ وہ نظر کے سامنے آجائے یا اُس کی تصویر بذریعہ قلم کے کھینچ دی جائے، یہ فطرۃً انسان کو مرغوب ہے ۔ چاہے وہ چیز اچھی ہو یا بُری ہو ۔ ایک حبشی یا زنگی جو مردم آزار بلکہ مردم خوار ہو اور جس کا حال یہ ہو کہ ۔ ع

لب خرس کے، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

اور وہ ہمارے سامنے یا ہمارے پاس آکر بیٹھ جائے تو طبیعت کو نہایت کراہت ہوگی اور اُس کا بیٹھنا ہم کو نہایت ناگوار ہوگا۔ لیکن اگر اُسی کی تصویر ہو بہو کھینچ کر کوئی ہمارے پاس لے آئے تو ہم اُس کو دیکھ کر نہایت پسند کریں گے اور مصوّر کی صنعت کی نہایت تعریف کریں گے۔ اسی طرح شعر میں بذریعہ محاکات و مرقع نگاری جس چیز کا منظر دکھایا گیا ہے اُسے ہم پسند کریں گے، چاہے وہ ناگوار یا خوشگوار چیز کا ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ شعر اگر اچھا ہو تو ضرور وہ ایک مؤثر چیز ہے۔ جس طرح شعر بوجہ محاکات کے پسند ہے اسی طرح شعر بوجہ موسیقیت کے بالطبع پسند ہے۔ یعنی شعر میں جتنا زیادہ جزو موسیقی کا ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ موثر اور دل پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ موسیقی بجائے خود بہت دل پسند اور موثر چیز ہے۔

مصور بذریعہ تصویر زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجودیکہ کبھی کبھی تصویر کا ہر جزو نمایاں نہیں کرتا مگر اپنے الفاظ سے اُس سے زیادہ اثر پیدا کرتا ہے جو خود اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ آپ جنگل میں جاتے ہیں سبزے پر اوس پڑی ہوئی دیکھتے ہیں، اُس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے شعر کے ذریعے آپ پر ایک نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا — ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ — زمرد را بمروارید بستہ

زمرد سے مراد سبزہ اور گوہر سے مراد شبنم کے قطرے، اوس جو سبزے پر پڑی ہے،

شاعر کہتا ہے کہ موتی اور زمرد ایک ہی لڑی میں ٹکے ہوئے ہیں -

اسی طرح آپ باغ میں جا کر گلاب کے پھول دیکھتے ہیں اور کانٹے بھی اور سبزہ بھی - یہ خوشنما چیزیں آپ کی نظر کو خوش کرتی ہیں - لیکن شاعر اپنے شعر سے آپ کے دل میں ایک نیا خیال پیدا کرتا ہے - چنانچہ شمیم امروہوی شاعر دربار ریاست رامپور کہتے ہیں ؎

کانٹے بھی تر زباں ہیں شگوفہ نیا یہ ہے   سبزے کے حسن میں بھی نمک سے مزا یہ ہے

اسی طرح شاعر عالم خیال میں ایک منظر دکھاتا ہے جو مصور بذریعہ تصویر دکھانے سے قاصر ہے - کہتا ہے ؎

مثل آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو   صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آپ کی ضیافت طبع کے لیے دو تین بند حضرت انیس کے اور عرض کروں - جن میں مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے اور مرصع نگاری کی بھی جھلک ہے - گرمی کا سماں دکھاتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت   پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینے میں تھے غازیوں کے رخت   سونلا گئے تھے رنگ جوانان نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے تھے
توسنے ہوئے سمند زبانیں نکالے تھے

اس بند میں وہ تمام جزئیات موجود ہیں جو گرمی کا سماں دکھانے کے واسطے ضروری تھے - یعنی پہاڑی راستے پر چلنے سے جو مسافروں کو تکلیف ہوا کرتی ہے - پانی اور سایے کا نہ ہونا اور سواروں کا پسینے میں تر ہونا، اُن کے رنگ سونلا جانا، بوجہ

تمازتِ آفتاب کے چہروں پر عباؤں کا ڈال لینا، گرمی اور پیاس سے گھوڑوں کا زبان نکال دینا، یہ سب معمولی واقعات ہیں جو گرم ملک کے سفر میں کم و بیش پیش آتے ہیں۔ رزم کا سماں ملاحظہ فرمائیے ؂

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی تھیں
نوکیں وہ تیز تھیں کہ دلوں میں کھٹکتی تھیں
نیزے تُلے ہوئے تھے سنانیں چمکتی تھیں
ترکش کھُلے ہوئے تھے کمانیں کڑکتی تھیں
پیکانیں تھیں کہ پھول تھے وہ بے کھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

میدانِ جنگ کا سماں اس بند میں دکھایا ہے۔ برچھیوں کا لچکنا، اُن کی اَنی کا تیز ہونا اور چمکنا، نیزہ بازوں کا اپنے نیزے تولنا، ترکشوں کا کھلا ہونا اور کمانوں کا کڑکنا، پیکانوں کا پھول کی کلیوں کی طرح دکھائی دینا اور کمانوں کے چِلّوں کا کانوں تک کھِنچا ہوا دکھائی دینا، یہ سب میدانِ جنگ کے آلاتِ حرب و ضرب اور واردات و واقعات ہیں۔ دوسرے شعر میں اور نیز ٹیپ میں صنائعِ لفظی بھی دلکش ہیں۔ پھر اسی شعر میں دُہرے دُہرے قافیے اور الفاظ دونوں مصرعوں کے ہموزن ہیں۔ نیزے، ترکش، تُلے ہوئے تھے، کھلے ہوئے تھے۔ سنانیں، کمانیں، چمکتی، کڑکتی۔ یہ الفاظ دونوں مصرعوں کے صنعتِ ترصیع ظاہر کر رہے ہیں اور ٹیپ میں پیکاں کی تشبیہ غنچے کے ساتھ پُرلطف ہے۔

صاحبو! مرقع نگاری اور مرصع نگاری کا موضوع ختم کرنے سے پہلے ایک بات آپ کی دلچسپی کے لیے اور عرض کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے وہ ایشیائی نظم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس میں خویشتن داری اور سلیف ہیلپ

اور آزادی کے مضامین نہیں ہیں۔ وہ واقف نہیں ہیں کہ فقط گلستاں اور بوستاں میں خودداری اور آزادہ روی کے کتنے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح اور شعراء کے یہاں بھی بے شمار مضامین ہیں۔ مثلاً ؎

بدست آہک تفتہ کردن خمیر   بہ از دست بر سینہ پیش امیر

گر راست سخن باشی و در بند بمانی   بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

دو نان از دست دو نانِ جہاں باشد سناں خوردن

سناں در سینہ خوردن بہ کہ از دو ناں دو ناں خوردن

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد   حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی ست

دگر نہ راعی خلق ست زہر مارش باد   کہ ہر چہ می خورد از جزیۂ مسلمانی ست

اسی طرح ہزاروں موقعوں پر شریفانہ اور آزادانہ مضامین کی بھرمار ہے لیکن میں صرف دو شعر نظامی کے سناؤں گا اور انگریزی خواں بھائیوں کو مخاطب کر کے عرض کروں گا کہ مختصر مضمون خویشتن داری اور سیلف ہیلپ کا اس سے بہتر سنائیں جو کسی انگریزی کتاب میں اُنھوں نے پڑھا ہو ؎

درختے شو از خویشتن ساز برگ   بہ مہمانی خویش تا روز مرگ

معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی روزی خود محنت کے ساتھ حاصل کرنے میں درخت بن جائے اور معاش حاصل کرنے میں کسی کا احسان مند اور محتاج نہ بنے۔ جیسے درخت اپنی ہی قوت و ہمت سے پرورش پاتا ہے۔ کسی آدمی کی مدد کا محتاج نہیں رہتا ہے۔ یہی طریق انسان کو اختیار کرنا چاہیے۔ درخت جب تک

بچہ ہے آدمی کی مدد کا طالب ہے لیکن جس وقت سے کہ وہ نوجوان ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ بچپن میں وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم اُس کو پانی دیں۔ مٹی بھی اُس کے لیے اچھی اور کافی ہونی چاہیے۔ دھوپ کی بھی اُس کو ضرورت ہے۔ ہوا بھی کافی اُس کو لگنا چاہیے۔ یعنی یہ کہ اُس کے گرداگرد جھاڑیاں اور درخت نہ ہوں کہ دھوپ اور ہوا کو روکیں لیکن نوجوان ہونے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی جسمانی اور خوراک کا کرلیتا ہے۔ پانی زمین سے جذب کرتا ہے۔ اُس کی جڑیں زمین کی مٹی کو پکڑ لیتی ہیں۔ ہوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے۔ اس کے سوا اُس کی ہمت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہیے۔ جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور ساون بھادوں کا مینھ اور ماگھ پوس کی سردی اور برف اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اُس میں میوہ لگتا ہے تب وہ ہمارے پتھر اور بانس کھاتا ہے۔ لوگ اُس سے پھل پھول، چھال، لکڑی، پتے لیتے ہیں۔ دوست اور دشمن دونوں کی خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہونچاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی اور عمارت کی لکڑی ہم کو دیتا ہے اور زندگی اور موت دونوں حالتوں میں فائدہ پہونچانے اور فیاضی کرنے میں عذر نہیں کرتا، پس ایک درخت سے زیادہ خویشتن داری، سیلف ہیلپ، سیلف ریسپیکٹ اور "اپنی مدد آپ کرو" کا احساس اور کس میں پایا جاسکتا ہے اور نہ ایسی ہمت، استقلال، تواضع، فیاضی اور رفاہ عام کسی میں ہوسکتا ہے۔

اب میں آپ کی خدمت میں توارد، سرقہ، ترجمہ، استنباط کے موضوع پر

کچھ بیان کروں گا - آج کل نو آموز شاعر اکثر اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں شاعر کا مضمون چُرا لیا - اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ توارد تو کسی صورت میں بھی قابلِ الزام نہیں ہے - علمائے معانی نے توارد کی مثال یہ دی ہے کہ دو راہرو ہیں - ایک آگے نکل گیا ہے اور جس طرف جس سڑک پر وہ چل رہا تھا، اُسی طرف اُسی سڑک پر دوسرا راہرو بھی چل رہا ہے - لیکن اس کو کچھ خبر نہیں ہے کہ میرے آگے ایک مسافر چلا گیا ہے - ایسی صورت میں اگر پہلے مسافر کے نقش قدم پر دوسرے مسافر کا قدم پڑ جائے تو کیا مضائقہ ہے اور کیا الزام اس پر آسکتا ہے - اسی طرح اغراض و مقاصد و مطالب متحدہ کے بیان میں توارد ہو سکتا ہے - مثلاً فردوسی نے یوسف زلیخا لکھی - اُس کے بعد جامی نے بھی کئی سو برس بعد یوسف زلیخا لکھی - تمام روایات و حکایات جو فردوسی نے بیان کیں وہی جامی نے کیں تو کوئی شخص جامی کو سارق اور اُس کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا -

توارد و سرقہ کے سوا ایک شکل ترجمے کی ہے - یعنی شاعر نے دیکھا کہ کسی زبان غیر میں کسی شاعر نے نہایت عمدہ مضمون پیدا کیا ہے - اُس کو اُس نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے لے لیا - چاہے وہ اُس میں زیادہ خوبی پیدا نہ کر سکا - یہ جائز ہے - کیونکہ اس میں زبان کی ترقی مقصود ہے - شاعر کے واسطے یہ خوبی کی بات ہے کہ وہ اپنی زبان کو ترقی دے اور عمدہ عمدہ مضامین لا کر اُس میں داخل کرے - جیسے ناصر علی کا شعر ہے ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بہ باغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

اس کا ترجمہ میر افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے زبان اُردو میں بہت خوبی کے ساتھ کیا ہے اور مطلع کا مطلع رکھا ہے ؎

نقاب ڈال کے رُخ پر وہ باغ میں آئے
کہ چھن کے نکہت گل بھی دماغ میں آئے

گو یہ ترجمہ بہت اچھا ہے لیکن ناز کا لفظ ترجمہ میں نہیں آیا جو شعر کی جان ہے۔ اگر فارسی شعر سے ناز کا لفظ نکال ڈالا جائے تو پھر کچھ خوبی نہیں رہتی۔ تاہم مترجم قابل تعریف ہے۔

ان کے سوا چوتھی شکل اور ہے۔ جس کو کتابوں میں تو سرقۂ مستحسن لکھا ہے۔ لیکن عالموں اور شاعروں نے زمانۂ حال میں اُس کو استنباط کہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شاعر پہلے شاعر کے مضمون کو پورا یا تھوڑا دانستہ لے لے۔ لیکن اُس مضمون کو بلند کر دے۔ یعنی اُس میں ترقی یا اضافہ کرے۔ جیسے فردوسی کا شعر ؎

یکے خیمۂ داشت افراسیاب ز مشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جب نظامی کی باری آئی تو اُس نے دیکھا کہ مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعر ثبوت نہ دے سکا۔ اُس نے ایک لفظ تبدیل کر کے ثبوت دیا اور یوں کہا ؎

یکے خیمۂ داشت چوں آفتاب ز مشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین شعر آسمان تک بلند ہو گئی۔ سعدی کہتا ہے ؎

ترا ہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا کیا تھا مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب سے یہ کہنا کہ تم یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کو چلے جاؤ

کس قدر نازیبا ہے۔ لہٰذا اُس نے ترقی دے کر شعر کو چمکا دیا ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

استنباط کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ایک چراغ سے سو چراغ روشن کر لیے جائیں تو کیا مضائقہ۔ تیل اپنا، بتی اپنی، چراغ اپنا۔ کسی کے یہاں چراغ جل رہا ہے۔ اُس کی لَو سے چراغ روشن کر لیا تو یہ کیا چوری ہے؟ اگر یہ چوری ہے تو ٹمٹم اور فٹن اور بائیسکل، ریل گاڑی، موٹر وغیرہ سب چوری میں داخل ہیں۔ کیونکہ چھکڑا اور اس کے پہیے تو موجود تھے، اُسی کی نقل تو ہے۔

صاحبان والا شان میں آپ کے شکریے اور خیر مقدم کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ع

کجا بودم اشہب کجا تاختم

لیکن خیال کرتا ہوں کہ آپ کی ضیافت طبع کا سامان بذریعہ اس تقریر کے کچھ ہوا ہو تو عجب نہیں۔

گوکھلے کا غم

مارچ ۱۹۱۵ء کے شروع میں بمقام سرستی بھون ایک جلسہ ماتمی،
مسٹر گوکھلے کے انتقال پُر ملال پر رنج و افسوس ظاہر کرنے کی غرض سے
منعقد کیا گیا۔ مسٹر ان صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل ماتمی
تقریر کی:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

خزاں رسید وگلستاں بآں جمال نماند — نوائے بلبل شوریدہ رفت وحال نماند

نشان لالہ ایں باغ از کہ می پرسی — برو کہ انچہ تو دیدی بجز خیال نماند

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان، ہر جماعت و گروہ کے اشخاص اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے نہایت عزیز ہموطن اور ملک و قوم کے پیشوا مسٹر گوکھلے کی بے وقت وفات حسرت آیات پر اشک ماتم بہائیں، جن کے مرنے کا نہ صرف ہندوستان کے باشندوں کو افسوس ہے، بلکہ برطانیہ نے بھی اپنا مشیر اور خیر اندیش سمجھ کر رنج و غم ظاہر کیا ہے۔ مرحوم کے مرنے سے ہمارا ایک پولیٹیکل رشی اُٹھ گیا اور گورنمنٹ برطانیہ اور گورنمنٹ ہند کا ایک خیر خواہ رکن سلطنت ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔ اس عظیم الشان اور

ہر دلعزیز حبیب وطن کے کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک طولانی تقریر کی ضرورت ہے۔ جو اس ماتمی جلسے میں زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی، لیکن چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ جس کا نوحہ یا مرثیہ پڑھا جائے اُس کی خوبیاں کچھ نہ کچھ بیان کی جائیں، اس لیے مختصر طور پر اس بے نظیر محب وطن کے عدیم المثال کارنامے معرض بیان میں لاتا ہوں۔

ہمارے دوست مرحوم جب فرگسن کالج میں پڑھتے تھے، اُس وقت سے اُن کے پروفیسروں کو اُن کی اعلیٰ درجے کی قابلیت کا احساس ہونے لگا تھا اور پیشین گوئی کی جاتی تھی کہ یہ شخص بڑا ہونہار ہوگا۔ پڑھ کر فارغ ہوئے، تو فرگسن کالج ہی میں پروفیسر کی حیثیت سے ۲۰ سال تک درس و تدریس کی خدمتیں انجام دیں۔ گزارے کے لیے کالج سے صرف پچھتر روپیہ ماہوار لیتے تھے۔ یہ ایثار کالج میں اب تک یادگار رہے اور آئندہ بھی یادگار رہے گا۔ ۱۸۸۸ء میں جبکہ وہ ۲۲ برس کے سن میں بمبئی پراونشل کانفرنس میں شریک ہوئے تو مسٹر ڈھولکر نے پیشین گوئی کی کہ یہ شخص کسی دن کانگریس کا صدر ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور آپ کانگریس کے صدر ہو کر بے تاج کے بادشاہ کہلائے۔

مسٹر گوکھلے عالم، فاضل، سوشل رفارمر یعنی مصلح اخلاق اور مصلح قوم و ملک تھے اور خاصکر ابتدائی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے پست اقوام کے بہت بڑے مربی اور سرپرست تھے، جن کو اونچی قوم کے ہندو چھونا بھی پسند نہیں کرتے۔ اچھوت ذاتوں کو وہ اونچی سطح پہ لاکر اپنے برابر

کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے۔ اُن غریبوں اور بیکسوں کی خاطر صرف محنت و کوشش ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی قسمت کے ساتھ مرحوم نے اپنی تقدیر کو وابستہ کردیا تھا اور اُن کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں شریک ہوکر اُن کا ساتھ دیتے تھے۔

ہمارے دوست مرحوم "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" ایسی قائم کر گئے ہیں، جو اُن کا نام نامی آیندہ نسلوں میں احسانمندی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ اس کے ممبر بھی اپنے مرشد اور گرو کی طرح زر و مال کو کچھ مال نہیں سمجھتے اور ہمارے ملک و قوم کی خدمت انواع و اقسام طریق پر کر رہے ہیں۔ عورتوں کو پڑھانا لکھانا، بیواؤں کی تکلیفیں کم کرنا اور اُن کی حالت درست کرنا، اچھوت ذاتوں کو اونچی سطح پر لانا، صفائی اور حفظانِ صحت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا خیال عام لوگوں میں پھیلانا، کواپریٹیو سوسائٹی کے ذریعے غریبوں اور بیکسوں کو سود کھانے والوں کے پنجۂ ظلم سے نجات دینا، یہ سب اعلیٰ درجے کی بیش بہا خدمات ہیں، جن سے ہمارا ملک مستفید ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ فوائد اُس مرحوم کی بدولت ہیں۔

مسٹر گوکھلے نے سات مرتبہ ولایت کا سفر ہم لوگوں کی خاطر کیا۔ پہلا سفر ۱۸۹۷ء میں اس غرض سے کیا تھا کہ رایل کمیشن کے روبرو ہندوستان کے ملکی مصارف کے متعلق شہادت دیں۔ وہاں جاکر ہمارے دوست نے اس موضوع پر اس کے جزئیات و کلیات کی نسبت ایسی

واقفیت ظاہر کی کہ لوگ عش عش کر گئے۔ دوسرا سفر ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ جس میں ہندوستان کے متعلق اُنچاس ۴۹ دن میں اُنھوں نے ۴۵، اسپیچیں دیں۔ تیسرا سفر بنارس کانگریس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ چوتھا ۱۹۰۸ء میں اور پھر ۱۹۱۲-۱۳-۱۴ء میں تین سفر ہوئے۔ ان سب سفروں میں مرحوم نے جو ملکی خدمات انجام دیں اُن کو چھوڑ کر صرف ۱۹۰۸ء کے ایک سفر کو لے لیجیے، کیونکہ اس سفر میں انھوں نے جو کام کیا صرف وہی ایسا ہے جو اُن کی بزرگی و عظمت ملک و قوم کے نزدیک قائم کرنے کے لیے اور یادگار ہونے کے لیے کافی ہے۔ وہ کام یہ ہے کہ آپ نے لارڈ مورلے سے کئی مرتبہ گفتگو کر کے ویسرائے کی کونسل میں توسیع اور اصلاح کرادی جس کی بدولت چھ سات برس سے ہم لوگ کثرت سے کونسلوں میں شریک ہونے کی غرض سے منتخب ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح ابھی حال میں جنوبی افریقہ جا کر وہاں کے وزیروں سے (مثل بوتھا اور اِسمٹس وغیرہ کے) مل کر ہندوستانیوں کی تکلیفیں دور کیں اور جو مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی اُس پر پانی ڈال دیا۔

مسٹر گوکھلے وہ شخص تھے، جو قوم کے فدائی تھے اور زندگی فقط ملک و قوم کے واسطے بسر کرتے تھے۔ طبیعت میں وہ انکسار تھا کہ سال گزشتہ جب گورنمنٹ نے کے، سی، آئی، ای، کا خطاب دیا، تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارا کام کرنے میں اس قدر محو تھے کہ اپنے کام اور اپنی ذات کی پرواہ اُن کو مطلق نہ تھی۔ وہ صرف ہمارے

کام میں ہمہ تن مصروف و مشغول رہا کرتے تھے - گویا ان کا عمل اس مقولے پر تھا ؎

وہ محو ہیں کہ ذرا غم نہیں ملال نہیں
ترا خیال ہے اپنا ہمیں خیال نہیں

انگریزی جملہ جو کہا جاتا ہے He died in harness وہ ہمارے دوست پر صادق آتا تھا کہ ہمارا کام کرتے کرتے جان دے دی - مرحوم نے زر و دولت کو خاک کی برابر سمجھا اور مثل رومن سینیٹرس (Senators) کے ہمیشہ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ افلاس کی زندگی بسر کی - وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سوشل رفارم (یعنی معاشرتی و تمدنی اصلاح) کو بھی ویسا ہی ضروری سمجھا جیسا کہ اصلاح ملکی کو - اُن کا قول تھا - 'Institutions are made by men and not men by institutions."

حضور ویسرائے نے اپنی کونسل میں فرمایا کہ "مسٹر گوکھلے نے صیغۂ مال، صیغۂ تعلیم اور امور انتظامی پر بحث کرنے میں نہایت قابلیت ظاہر کی اور جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسئلے کو، جو ہندوستانیوں سے متعلق تھا، نہایت مدبری اور خوبی سے سُلجھایا، جو بظاہر عقدۂ مالاینحل تھا" اور یہ بھی فرمایا کہ "وہ نہ صرف کونسل کے بیش بہا ممبر تھے بلکہ ہمارے دوست بھی تھے" یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسٹر گوکھلے کو جو واقفیت مال کے صیغے سے تھی وہ بیس برس ادھر سے کسی سکریٹری محکمۂ مال یا کسی ممبر صیغۂ مال کو حاصل نہیں ہوئی - ہمارے لفٹننٹ گورنر بہادر سر جیمس مسٹن جو پہلے فنانشل سکریٹری گورنمنٹ ہند تھے، وہ مسٹر گوکھلے کو مسٹر گلیڈسٹن سے تشبیہ دیتے تھے -

مسٹر گوکھلے کو گورنمنٹ اور حکام اس وجہ سے زیادہ پسند کرتے تھے کہ اُن میں خود غرضی، سخن پروری اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ بخلاف اس کے انکسار، سچائی اور معقول پسندی تھی۔ دنیا کے معاملات میں دو باتوں کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ خوش تدبیری اور ایمانداری سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سخن پروری اور ضد نہ کی جائے، بلکہ ہمیشہ سمجھوتا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عملی سیاست میں ہر موقع پر برابری اور آزادی کا دعویٰ کرنا اور حقوق انسانی پر لڑنا ٹھیک نہیں ہے، بعض وقت اس اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

یہ سب باتیں مسٹر گوکھلے میں نمایاں طور پر تھیں، جن کے باعث اُن کو سوشل اور پولیٹیکل معاملات میں کامیابی ہوا کرتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں جیسا کہ اب ہے، عامۂ رعایا اور نیز گورنمنٹ کو ایسے شخص کی بڑی ضرورت ہے کہ جس میں مثل مسٹر گوکھلے کے، خوبیاں اور لیاقتیں ہوں، اس لیے اُن کی وفات سے جو نقصان پہونچا وہ ایسا قومی اور ملکی نقصان ہے جو ملک اور قوم کی بدقسمتی پر دلیل قاطع ہے۔ اصل میں مسٹر گوکھلے کے طور وطریق، اُن کی عقلمندی، فرزانگی، خوش تدبیری، سچائی اور ایمانداری اس بات کی روشن مثال ہے کہ مفتوحہ ملک وقوم کا ایک لائق فرزند اپنی قوم و ملک کو پستی مذلت سے اُبھار کر کس طرح بلند سطح پر لا سکتا ہے اور رعایا اور گورنمنٹ

دونوں کا معتمد علیہ بن سکتا ہے۔

جب مسٹر گوکھلے کا جنازہ اُٹھا، تو بیس ہزار آدمی ماتم کرنے والے اُس کے ساتھ تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں ماتم کیا اور وئیسرائے گورنر بمبئی اور حضرت جارج پنجم اور آغا خان کے تار ہمدردی اور رنج وغم کے اظہار میں آئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دفتر سب بند ہو گئے۔ الہ آباد میں، جہاں اُن کے پھول جمنا گنگا کے سنگم میں ڈالے گئے، عام طور سے تعطیل ہو گئی۔ پھولوں کے ساتھ جو جلوس تھا، اُس میں بڑے بڑے عمائدین کے دوش بدوش گورنمنٹ کی طرف سے کلکٹر ضلع نے بھی شرکت کی اور الہ آباد میں جو جلسہ ماتمی ہوا اُس میں حکام ہائی کورٹ، کمشنر اور کلکٹر اور تمام نامی گرامی ہندو مسلمان شریک ہوئے۔

لارڈ ہارڈنگ ہی نے اُن کی لیاقتوں اور خوبیوں کی داد نہیں دی بلکہ اُن کی زندگی میں ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو نے بھی، جب اُن کی تقریر بجٹ پر سنی، تو فرمایا کہ "یہ سب سے اچھی اور ایسی تقریر ہے کہ انگلستان میں بھی بہت کم لوگ ایسی تقریر کر سکتے ہیں۔" اسی طرح سر ایڈورڈ بیکر نے فرمایا کہ "میری خواہش سب سے بڑی یہ ہے کہ میرے بعد فنانشل ممبر اس کونسل کے مسٹر گوکھلے مقرر ہوں۔"

مسٹر گوکھلے نے ہمیشہ اپنے آپ کو ماتحت کارکن یعنی ایک چھوٹا کام کرنے والا اور اپنے مقابلے میں راناڈے، سر فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی وغیرہ کو ترجیح دی۔ دنیا میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو کوئی بڑوں کو مقدم سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اُن کا چھوٹا اور پیرو خیال کرتا ہے، وہ آخر میں خود بڑا مانا جاتا ہے اور جو دوسروں کا نام قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کا نام خود بھی دنیا میں

قائم اور برقرار رہا کرتا ہے ۔ چنانچہ اسی فلسفیانہ جذبے کے باعث آج مسٹر گوکھلے کے نام کا قلمرو ہند میں ڈنکا بج رہا ہے ۔

مسٹر گوکھلے کی تعریف سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اُنھوں نے پولیٹیکل معاملات میں اعتدال کا خیال زیادہ رکھا ۔ مسٹر تلک نے مسٹر گوکھلے کی وفات کے وقت تک یہ اعتراض کیا کہ وہ Extremists اور Moderates میں اتحاد پیدا نہ کرا سکے اور دونوں کی شرکت سے متحدہ کانگریس وجود میں نہ لا سکے ، لیکن جب جنازہ گھاٹ پر پہونچا ، تو مرحوم کے مخالف مسٹر تلک نے خود Funeral oration دیا اور ہزاروں آدمیوں کو جو وہاں موجود تھے ہدایت کی کہ مرحوم کے طور وطریق اختیار کرو اور اُن پر پورا عمل کرو ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خود مسٹر تلک نے بھی مرحوم کا ڈھنگ اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی ۔

صاحبان والاشان ! الہ آباد جیسے متبرک مقام میں ، جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہے ، جہاں اس شہید ملکی کے پھول ڈالے گئے ہیں ، ایک یادگار بنانی چاہیے تاکہ لاکھوں جاتری ، جو وہاں جاتے ہیں ، اس فدائے قوم و ملک کی یادگار کے درشن کیا کریں اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی اُس کی یاد میں نچھاور کیا کریں ۔ ہم سب کو مسٹر گوکھلے کے کارہائے نمایاں سے یہ سبق ملتا ہے کہ خودغرضی چھوڑ کر ملک کے بھائیوں کی خدمت سچائی اور ایمانداری سے کریں اور جو کچھ مرنے والا کر گیا ہے اُس کو سعی و کوشش سے بحال و برقرار رکھیں ، تاکہ ہمارے کام بھی آیندہ نسلوں کے لیے دنیا میں یادگار رہ جائیں ۔

عمل کن کہ فردا نماند و لیک ۔۔۔ جزائے عمل ماند و نام نیک

پنڈت بشن نراین در کا ماتم

پنڈت بشن نراین در بیرسٹر کی دفات حسرت آیات کے غم میں ایک جلسۂ عام بمقام سرستی بھون فرخ آباد اس غرض سے کیا گیا کہ مرحوم کے انتقال پُرملال پر رنج و افسوس ظاہر کیا جائے اور اُن کے کارنامے اور اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ منظر عام پر لائے جائیں۔ مُشران صاحب نے جو تقریر اس موقع پر کی وہ درج ذیل ہے:-

کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی — کہاں ہیں وہ گرُ دان زابل ستانی
گئے پیشدادی کہاں اور کیانی — مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کوئی کھوج کلدانیوں کے
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کے

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان عیسائی ہر گروہ اور جماعت کے اشخاص، اس ماتمکدے میں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ پیشوائے قوم اور فدائے ملک، پنڈت بشن نراین در کے انتقال، پُرملال پر اشک ماتم بہائیں اور اُن کا نوحہ اور مرثیہ پڑھیں۔

صاحبو! ہمارے پنڈت صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کی مشہور تعلیم گاہ کیننگ کالج میں پائی۔ لیکن بی، اے کی ڈگری حاصل نہ کرنے پائے تھے

کہ ولایت جانے کا شوق دامنگیر ہوا - لڑکپن ہی سے ذہانت کے آثار بُشرے سے نمایاں تھے اور نہایت درجہ ہونہاری ٹپکتی تھی - تحصیل علم کی طرف رجحان خدا داد تھا اور ذہن سلیم اور طبع مستقیم قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئے تھے - آپ کشمیری پنڈتوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ولایت جاکر مذہبی قیود کی زنجیریں توڑ دیں - کشمیری کلب لکھنؤ کے سکریٹری تھے - مگر اُسی وقت مردم شناس اشخاص کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا آسمان شہرت پر آفتاب کی طرح چمکے گا - چنانچہ ولایت جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وہاں کے اعلیٰ درجے کے عالم اور فلسفی پروفیسر مکیس میولر اور پروفیسر ہکسلی وغیرہ کی صحبت باسعادت سے مستفید ہوکر اپنے دل و دماغ کو روشن کیا اور اپنے بھائیوں کے واسطے چراغ ہدایت بن گئے - اُن کی واپسی پر ہندوستان میں اُن کی قوم میں جھگڑا ہوا اور دو فریق بن گئے - ایک فریق اُن کا طرفدار تھا جو بشن سبھا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا فریق مخالف دھرم سبھا کہلایا -

ولایت سے واپس آکر آپ نے ملک و قوم کی خدمت پر کمر ہمت چُست باندھی - اُسی سال مدراس کانگریس میں شریک ہوئے اور ایسی اسپیچ دی جو اعلیٰ درجے کی تقریروں میں شمار کی جاتی ہے - ہیوم صاحب نے اس اسپیچ کی داد دی - پنڈت جی مرحوم انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے حامی و مددگار تھے اور کانگریس پلیٹ فارم پر اُن کی تقریریں خوش بیانی اور فصیح الکلامی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھیں - اخبار ایڈوکیٹ لکھنؤ کے سب سے پہلے ایڈیٹر تھے اور پھر اُس کے مشہور نامہ نگار رہے - اخبار لیڈر الہ آباد میں بہت قابل قدر

مضامین درج کیا کرتے تھے۔ اُن کی تصنیف سے ایک پمفلٹ ہے جس کا نام "سائنز آف دی ٹائمس"، ہے جو نہایت قابل قدر ہے۔

پنڈت صاحب لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ممبر عرصے تک رہے اور وسیرائے کی کونسل میں بھی شریک ہوئے۔ ایک دفعہ پراونشل کانگریس کے پریسیڈنٹ اور ایک دفعہ کانگریس کے میر مجلس منتخب کیے گئے۔ ظاہر ہے وہ درجہ، جو کانگریس کے پریسیڈنٹ کا ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے۔ لکھنؤ میں جب کانگریس ہونے والی تھی تو اُس کی استقبالی کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے مگر اشتداد علالت کے باعث استعفا دے دیا۔

پنڈت صاحب اُردو اور فارسی کے فن انشا کے ماہر تھے اور انگریزی زبان کے بھی بڑے ادیب تھے اور اُس پر خوب عبور رکھتے تھے۔ اُن کے انگریزی مضامین نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان میں بہت قابل قدر سمجھے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ زبان غیر پر عبور ہونا مشکل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اپنی مادری زبان پر قدرت حاصل کرنا کیا آسان کام ہے؟ وہ اُردو کے بڑے خوش فکر شاعر تھے اور اُن کی شاعری نئے خیالات سے بھری ہوئی تھی اور نہایت قدر و منزلت کے لائق سمجھی جاتی تھی۔

پنڈت صاحب نے چودہ۱۴ برس سل کے عارضے سے سخت تکلیف پائی لیکن باوجود اس تکلیف کے کبھی ملک و قوم کا کام کرنے سے غافل نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمیشہ زندہ دلی اور مستعدی سے ہمارے کام میں محو رہے اور اپنی تکلیف کا خیال کبھی نہیں کیا اور یہی سمجھا کیے کہ میں دوسروں کے واسطے

زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں - ہنستے ہی ہنستے خندہ پیشانی کے ساتھ جان دے دی اور سب کو روتا چھوڑ گئے - گویا اُن کا قول یہ تھا کہ ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو | ہمہ خندہ نبدند و تو گریاں
توچناں زی کہ بعد مردن تو | ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

انگریزی میں جو کہا جاتا ہے کہ He died in harness یہ جملہ ان پر صادق ہے - واقعی اُنھوں نے کام کرتے ہی کرتے جان دے دی - ہمیشہ اُن کے مزاج میں قناعت رہی - قابل عزت افلاس میں بسر اوقات کی، لیکن مرتے وقت نیک کاموں کی دولت کثیر اپنے ساتھ لے گئے جس پر بڑے بڑے مالداروں کو رشک ہونا چاہیے - اُن کی آزاد خیالی، راستبازی، مستقل مزاجی اور کسر نفسی کے متعلق ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے بہت ٹھیک لکھا ہے - وہ فرماتے ہیں -

"He was a mau of courage and courage was based on the solid foundation of selflessness—firm as steel and pure as gold"

صاحبو! اُن کی زندگی اس بات کا نمونہ تھی کہ کیونکر انسان جسمانی تکلیفوں کو ہمت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے اور زندہ دلی کے ساتھ اپنے ہمجنسوں کا کام بخوبی تمام انجام دے سکتا ہے اور کیونکر تکلیف اور افلاس کی حالت میں بھی قناعت اور دیانت اور آزاد خیالی پر مستقل مزاجی سے قائم رہ سکتا ہے اور صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل کے ذریعے جوانوں اور بوڑھوں کا پیشوا بن سکتا ہے - ہم کو پنڈت صاحب مرحوم کی زندگی سے سبق سیکھنا

چاہیے کیونکہ فقط عمل یعنی نیک کام ہی ہمارے ساتھ جائیں گے اور کچھ نہیں ہے

عمل کن کہ فردا نماند ولیک جزائے عمل ماند و نام نیک

صاحبو! ہمارا رنج وغم اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ہماری بدقسمتی بلکہ تمام ملک کی بدنصیبی سے ہمارے چند پیشوا اور حبیبِ وطن، مثل کرشنا سوامی آئیر، مسٹر گوکھلے، مسٹر گنگا پرشاد ورما، مسٹر سبرا منیا آئر اور سر فیروز شاہ مہتا کے، اس تین برس کے عرصے میں یکے بعد دیگرے اُٹھ گئے اور اُن کے بعد ہمارے دوست مسٹر در بھی ہم کو داغ مفارقت دے گئے۔ یہ سب ایسے اشخاص تھے کہ زمانہ ہاتھ ملتا رہے گا کہ افسوس میں نے ایسے بے نظیر آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔ اہل لکھنؤ ہم سے بھی زیادہ افسوس کر رہے ہیں کیونکہ وہاں سے تین پیشوایان قوم یعنی بابو گنگا پرشاد ورما، پنڈت بشن نراین در اور پنڈت اقبال نراین مسلدان رخصت ہو گئے۔

محفلِ مشاعرہ

میں

حاضرین کی ضیافت طبع

ماہ مئی ۱۹۰۲ء میں ایک مشاعرہ بمقام چھپرا مئو (ضلع فرخ آباد) منشی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل کے مکان پر منعقد ہوا۔ جس میں علاوہ فرخ آباد و فتح گڑھ وغیرہ کے بیرونجات کے بھی کچھ شعراء شریک تھے۔ مشران صاحب بھی حسب الطلب شریک بزم سخن تھے۔ بانی محفل کی فرمائش سے موصوف نے ارباب انجمن کا خیر مقدم کیا۔ سامعین نے یہ فرمائش کی کہ شکریہ کی اسپیچ میں ارباب مشاعرہ کی ضیافت طبع کا سامان بھی ہو۔ چنانچہ موصوف نے حسب ذیل خطبہ بداہتہً ارشاد کیا جس کو سن کر حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے۔

حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت تفویض ہوئی ہے کہ میں صاحب خانہ کی طرف سے آپ سب صاحبوں کا خیر مقدم کروں کہ آپ نے اپنی تشریف آوری سے اس بزم سخن کو طراوت تازہ اور رونق بے اندازہ بخشی ہے۔ کاش یہ کام کسی شاعر نغز گفتار کو تفویض کیا جاتا جو نظم میں آپ کا شکریہ ادا کر کے آپ کو محظوظ کرتا۔ بخلاف اس کے اس فرض کی انجام دہی ایک ایسے ہیچمداں پنبہ دہاں کے ذمہ

اور وہ بھی ٹوٹی
کی گئی ہے جو نظم کا مذاق سلیم اور وجدان صحیح نہیں رکھتا اور نثر میں اور وہ بھی ٹوٹی
پھوٹی نثر میں اپنے خیالات ظاہر کرے گا۔ صاحبان ذیشان! نثر بمقابلہ نظم کے،
ایک کم رتبہ اور کم وزن چیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ میرے لیے اور بھی مشکل چیز ہے ؎

خوش ست نثر ولے شان نظم افزون ست
اتاقہ وسر مصحف کلام موزون ست

اس موسم گرما میں آپ لوگوں کا اس جگہ تشریف لانا اور اکثر صاحبوں کا
دور دست مقامات سے قدم رنجہ فرمانا، مغتنمات سے ہے اور نہایت شکریے
کے قابل ہے۔ آپ سب حضرات نکتہ سنج کے جمع ہونے سے اس بزم شاعرہ
میں وہی رونق و آرائش ہو گئی ہے جو باغوں کی زیب و زینت اشتداد بہار
میں ہو جاتی ہے۔

آپ تمام احباب کو اور ہر قوم اور ہر جماعت کے اصحاب کو یکجا جمع دیکھ کر
میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ یہ کہوں ؎

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

صاحبو! ہمارا قصبہ چھپرا مئو اس ضلع کے اور قصبات کے مقابلے میں فی الجملہ
ایک مردم خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں متعدد شاعر اور عالم پیدا ہو چکے ہیں۔
ایک شاعر نے چھپرا مئو کی تعریف میں کہا ہے ؎

بصرہ بنا دمشق بنا لکھنؤ بنا
کچھ خاک بچ رہی تھی کہ چھپرا مئو بنا

ایسے مقام میں شاعروں اور نکتہ سنجوں کا جمع ہونا علم و فضل کے حق میں بہت
مفید ہوگا اور جو لوگ شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پر
تازیانے کا کام دے گا۔

حضرات! علم تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم و ملک میں جب کہ اوّل اوّل تہذیب و شائستگی کی روشنی پھیلی تو نظم نے وہاں کے علم ادب پر اپنا تسلط جمایا - اُس وقت بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے، نظم میں بیان کیے جاتے تھے - اِس وقت بھی جبکہ نثر اُردو نے ہزاروں بکار آمد کتابیں ہمارے اُردو علم ادب میں مُدوّن کر دی ہیں، نظم کا وہ تسلط کم نہیں ہوا ہے بلکہ زباندانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اب بھی ہے، جو نظم کو بہت پسند کرتا ہے اور نظم ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے - حق یہ ہے کہ بعض باتیں جو لطف نظم میں دیتی ہیں، نثر میں ہرگز وہ مزہ نہیں آتا - مثلاً زورِ بیاں، شوکت الفاظ، تنوع تمثیلات، برجستگی استعارات، شوخی کنایات وغیرہ — مگر اب وہ وقت آگیا ہے کہ نظم اُردو میں نئے نئے مفید اور بکار آمد مضامین دخل پائیں - قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اُس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچانے والے جذبات، قوم کی غیرت اور حمیت کی رگ کو حرکت دینے والے مضامین اور نام و ننگ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والے خیالات، اگر نظم اُردو میں داخل کیے جائیں اور اُس کے ساتھ آدابِ شاعری کا برتاؤ پورا پورا کیا جائے، تو عام طبائع کے نزدیک نہایت پسندیدہ ہو اور ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہو - اگر یہ ترمیم نظم اُردو میں ہو جائے - (جو بالفعل ہو رہی ہے اور اُمید ہے کہ آیندہ اس سے بھی زیادہ ہو جائے گی) تو پھر اُردو نظم کا مقابلہ دنیا میں کوئی دوسری نظم نہ کر سکے گی - آج کل دو شاعر یعنی مولوی شبلی نعمانی اور مولوی الطاف حسین حالی ایسے ہی نئے خیالات کی روح نظم اُردو کے

قالب میں پھونک رہے ہیں اور ملک اور قوم کے شکریے کے سزاوار ہیں۔

بعض لوگوں نے جن کو نظم کا مذاق بالکل نہیں ہے یا بہت کم ہے اور جنھوں نے ایشیائی شاعری کا پورا لطف حاصل نہیں کیا ہے اور محض انگریزی خیالات کے قدردان ہیں، یہ خیال کر رکھا ہے بلکہ یک طرفہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ایشیائی نظم خواہ وہ اُردو ہو یا فارسی، نہایت ناقص ہے اور سوائے عشقیہ مضامین کے اُس میں اور کچھ نہیں ہے۔ اس خیال کی تردید اگر اس وقت بطور مختصر کی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اُن کو معلوم نہیں کہ ایشیائی نظم کا پہلا اصول زبان سکھانا ہے۔ آداب و اخلاق کے مضامین جن کی کمی ہرگز نہیں ہے، ایسے پیرایے میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لوازمات شاعری کا پورا پورا برتاؤ ہو جائے۔ جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آداب شاعری سکھائے جائیں اور اصناف سخن پر عبور ہو۔ ردیف و قافیہ کی قید ایسا قافیہ تنگ کرتی ہے کہ شاعر الفاظ کی تلاش اور بندش میں اور اپنے خیالات کی رو میں حقیقت واقعیہ سے دور پڑ جاتا ہے اور اسی باعث فوق العادۃ باتیں اکثر بیان کرنے لگتا ہے۔ انگریزی نظم ہرگز ہرگز زبان نہیں سکھاتی۔ نہ اُس میں ردیف اور قافیے کی پابندی ہے، اسی وجہ سے اخلاق کا بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہوتا ہے اور واقعات نفس الامری کا مرقع کھینچنے میں خلاف عادت باتیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شعرائے ہند و پارس میں بہت شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تغزل میں بھی بیشتر آداب و اخلاق کے مضامین نہایت قابل قدر لکھے ہیں اور سیکڑوں مفید اور بکار آمد مضامین باندھے ہیں۔ اور با ایں ہمہ

صنعت شاعری کا پورا پورا برتاؤ کیا ہے - میں آپ کی اجازت سے اس وقت چند اشعار امیر لکھنوی کے سناؤں گا جو بالکل خط وخال کے مضامین سے معرّا ہیں، جن سے بخوبی ثابت ہوگا کہ نظم اُردو میں بھی کس قدر تجربے کے مضامین باندھے گئے ہیں - اس سے میرے دو مطلب ہیں - ایک تو یہ کہ معترضین کے اعتراض کی رد ہو اور دوسرا یہ کہ جو لوگ عشقیہ مضامین باندھنے کے عادی ہیں اُن کو معلوم ہو جائے کہ جب امیر ایسے اُستاد کامل فن نے ایسے مضامین باندھے ہیں تو تبعین کو پیروی و تقلید کرنے میں ہرگز مضائقہ نہیں، بلکہ ملک اور قوم کی ضرورتیں داعی ہیں کہ ایسے مضامین بکثرت باندھے جائیں -

خاموشی کی تعریف کرتا ہے تو کیا بلیغ تمثیل دیتا ہے جو اُسی قدر نرالی ہے جس قدر بلیغ ہے - کہتا ہے کہ :-

خاموشی ——— زباں خاموش رکھ اے دل کہ قابو ہو نہ دشمن کا
حقیقت میں ہے زنگ کارواں جاسوس رہزن کا

رفاہ عام ——— وہ ہوں راحت رسانِ خلق، مر کر بھی یہ حسرت ہے
چراغ آ کر کوئی مفلس اٹھا لے جائے مدفن کا

سخت بات کی چوٹ ——— معاذ اللہ کیا زخمِ زبان خلق کاری ہے
گلی شمشیر میں بھی کاٹ ہے شمشیر آہن کا

راحت دنیا کی ناپائداری ——— زمانہ دے اگر راحت، پیام مرگ جان اُس کو
کہ حلوا زہر سے خالی نہیں ہے دست رہزن کا

جو اہل حرص ہیں نعمت میں بھی محروم راحت ہیں
دہاں بند ایک دم کھلتا نہیں ہے گاوخرمن کا — اہل حرص کی محرومی

قدم سے جو لگے ہیں آج کل دیں گے تجھے ایذا
کہ نعل آہنیں دیکھا ہے آلہ داغ توسن کا — تملق دشمن ناقابل اعتبار

کسی کو پیچ میں دیکھا دل اپنا رحم سے ٹوٹا
خس گرداب دریا سنگ ہے ہم کو فلاخن کا — رحم دلی

ایک سمجھو جان کا دشمن ہو چھوٹا یا بڑا
کام وقت ذبح کرتی ہے چھری تلوار کا — دشمن کو حقیر نہ سمجھو

عہد پیری میں کمال اپنا ہوا رونق پذیر
دن ڈھلا جب وقت آیا گرمی بازار کا — پیری میں کمال کو فروغ ہوتا ہے

کعبہ و دل دونوں گھر اس کے ہیں پر اتنا ہے فرق
دور کی وہ راہ ہے یہ راستہ نزدیک کا — مذاق عارفانہ

ظلم اہل ظلم پر کچھ ظلم میں شامل نہیں
کون غارت گر ہے مجرم خانہ زنبور کا — ظالموں پر ظلم روا ہے

جھکے جو آپ سے انساں کو جھکنا اس سے لازم ہے
جو خم شمشیر میں پایا کیا خم ہم نے گردن کو — متواضع سے جھکنا چاہیے

عدو کی سرکشی موقوف ہو جاتی ہے احساں سے
یہ وہ ہے بوجھ بھاری جو جھکا دیتا ہے گردن کو — دشمن کا دفعیہ احسان ہے

پشیماں ہوں گے جو قصد شکست غیر رکھتے ہیں
بجز سرگشتگی حاصل ہے کیا سنگ فلاخن کو

دوسرے کا نقصان چاہنے والا پشیمان ہوتا ہے

حریصوں کو سوائے سوز غم نعمت سے کیا حاصل
کہ جلتا ہے فتیلہ جس قدر پیتا ہے روغن کو

حریص زیادہ متفکر ہوتا ہے۔

بلا سے امن اگر چاہے کوئی پیدا حمایت کر
ہوا گل کر نہیں سکتی چراغِ زیر داماں کو

حمایت کے سبب بلا سے امن

سوا تذلیل کے کیا ہے غرض جب درمیاں آئی
کہ اونچا ہاتھ منعم کا ہے نیچا ہاتھ سائل کا

غرض باعث ذلّت ہے ــــ

فروتن واجب التعظیم ہیں کچھ شک نہیں اس میں
جھکی مقتول کی گردن تو اُٹھا ہاتھ قاتل کا

انکسار میں توقیر ہے ــــــ

صاحبو! آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ کس قدر سچے مضامین ہیں اور قدرت و عادت کے مطابق واقع ہوئے ہیں، بااین ہمہ صنعت شعری کا پورا برتاؤ کیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ زبان کس قدر منجی ہوئی ہے اور پاک صاف اور شستہ ہے گویا آب کوثر میں دُھلی ہوئی ہے۔ کوئی لفظ دبتا ہوا نہیں۔ کوئی حرف گرتا ہوا نہیں۔ یہی کیفیت فارسی میں میرزا محمد علی صائبؔ اصفہانی کی ہے۔ اُس کے چند اشعار بطور مُشتے نمونہ از خروار، نذر سامعین باتمکین کیے جاتے ہیں۔

امید فیض ز نو دولتاں مجو صائبؔ
کہ نونہال کجا طاقت ثمر دارد

نو دولت بے فیض ہوتے ہیں۔

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد
بے زری کرد بمن اُنچہ بقاروں زر کرد — سخی کو بے زری سے شرمندگی

بپوش چشم خود از عیب دیگراں صائب
اگرچہ می نتوانی برہنہ پوشیدن — عیب پوشی

دہن خویش بدشنام میالا صائب
ایں زر قلب بہر کس کہ دہی باز دہد — دشنام دہی عیب ہے

دست طمع بہ پیش کسے کردہٗ دراز
پل بستہ اکہ بگزری از آبروئے خویش — مانگنے میں بے آبروئی

اگر دشمن دوتا گردد بہ تعظیمش مشو غافل
کمر خم کردن صیاد آفت جان مرغان است — تملق دشمن آفت جاں

حضرات انجمن! بزم مشاعرہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف المراسم اور مختلف المذاہب حضرات یکجا جمع ہوتے ہیں، جو بلا خیال ملت و مذہب کے باہم دوستانہ برتاؤ اور برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں اور علوم و فنون کی تازگی کے سوا اس سے اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے، جس کی ضرورت اس وقت ہم لوگوں کو زیادہ ہے۔ پس ایسے جلسوں کو مغتنمات سے شمار کرنا چاہیے۔

یہ ہم جلیس یہ جلسے ہیں بزم ہستی تک — لحد میں کوئی کسی کا شریک حال نہیں
خدا نے دی ہے عجب منزلت محبت کو — یہ بزم وہ ہے کہ جس میں صف نعال نہیں

راماین پر ایک نظر

بتاریخ ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۳۱ء پروفیسر کمار صاحب رئیس لاہور جو تھیوزافیکل سوسائٹی کے ایک رکن اعظم ہیں، بمقام سرستی بھون تشریف لائے اور ایک جلسۂ عام زیر صدارت مشران صاحب منعقد ہوا - موصوف نے اس جلسے میں حسب ذیل خطبہ صدارت ارشاد فرمایا :-

بھائیو اور بہنو! مجھے پہلے آپ سب صاحبوں کا شکریہ دلی ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے مجھے اس جلسے کی صدارت دے کر میری عزت افزائی فرمائی۔ نہایت خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے مہمان عالی شان پروفیسر کمار صاحب اس جلسے میں رونق افروز ہیں اور اُس کی زیب و زینت کا باعث ہو رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو آپ صاحبوں سے روشناس کرنے کے لیے میں زیادہ طویل تقریر کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ چند مرتبہ پہلے بھی پروفیسر صاحب کا خیر مقدم، ہم لوگ اس شہر میں کر چکے ہیں اور اُن کا نام نامی تھیوزافیکل سوسائٹی کے رکن اعظم کی حیثیت سے پنجاب اور اضلاع متحدہ میں معروف و مشہور ہے۔ اس وقت ہمارے دوست، پروفیسر صاحب موصوف راماین پر لکچر دیں گے، جو برگزیدہ عالم اور فخر بنی آدم، مقتدائے عالمیاں اور پیشوائے جہانیاں یعنی شری رام چندر جی اور ملکۂ فردوس جاہ، مادر گیتی پناہ یعنی شری سیتا مہارانی کے

سوانح حیات کی ایسی یادگار ہے، جس کو ۲۴ کروڑ ہندو حرزِجاں بنائے ہوئے ہیں -

حضرات! یہ راماین یادگار ہے اُن بے نظیر اور مشہورِ عالم بہادروں کی، جنھوں نے لشکرِ جرار سمندر پار لے جا کر راون کے ایسے زبردست شہنشاہ کو شکست فاحش دی، لیکن اُس کی سلطنت کو مثل شاہان دنیا کے اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا - بلکہ اُسی کے خاندان کے ایک بھائی کو وہ سلطنت بخش دی - جس سے مراد یہ تھی کہ راون راج جو ظلم و ستم کی یادگار تھا دنیا سے مٹا دیا جائے اور عدل و رحم کی حکومت یعنی رام راج دنیا میں قائم ہو -

یہ راماین یادگار ہے اُس سعادتمند فرزند ارجمند کی جس نے صرف اپنے باپ ہی کے حکم کی متابعت میں نہیں، بلکہ اپنی سوتیلی ماں کے حکم کی تعمیل میں، سلطنت جیسی عزیز چیز کو چھوڑ دیا اور چوٗدہ برس جنگلوں اور بیابانوں میں بود و باش اختیار کی - مجبوری سے نہیں، بلکہ نہایت مسرت سے، اپنا فرض مذہبی و اخلاقی سمجھ کر - پھر اس جلاوطنی میں بھی اس بے نظیر بہادر نے وہ بے بہا خدمتیں انجام دیں جو کسی سے نہ ہو سکی تھیں، یعنی پہاڑوں اور جنگلوں کو اُن شیاطین سے پاک و صاف کر دیا جو رشیوں اور مُنیوں کی عبادت میں خلل ڈالتے تھے - ان بیہڑ بیابانوں میں وہ ہر وقت دیوؤں اور جنوں، درندوں اور زہریلے حشرات الارض سے دوچار رہتا تھا، جو اُس کے خداداد تصرّف کے آگے سر جھکا دیتے تھے -

یہ رامائن یادگار ہے اُن خاتونِ عالی قدر و عالی منزلت کی، اُن عفت مآب وعصمت جناب بی بی کی، جنھوں نے شاہی محلوں میں ناز و نعمت سے پرورش پائی تھی، لیکن شوہر کے ساتھ جنگلوں اور بیابانوں میں کانٹوں پر اس خوشی سے چلتی تھیں، گویا پھولوں کے فرش پر چل رہی ہیں۔

یہ رامائن یادگار ہے اُن سوتیلے بھائیوں کی سچّی محبت کی، جنھوں نے اپنے بڑے سوتیلے بھائی کی جدائی میں سلطنت کرنا گوارا نہ کی اور ایسی عزیز چیز چھوڑ دی جس کی برابر دنیا میں کوئی چیز پیاری نہیں، جس کے لیے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا رہتا ہے، جس کے حاصل کرنے کے لیے باپ بیٹوں کو ہلاک کر دیتا ہے، اُن کی آنکھیں نکلوا لیتا ہے اور بیٹے باپ کو قتل کرا دیتے ہیں یا اُس کو قید کر دیتے ہیں۔

یہ رامائن یادگار ہے اُن محبت کرنے والے بھائیوں کی، جنھوں نے سلطنت کا لطف چھوڑ کر اپنے جلاوطن بھائی کو جنگلوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا، تاکہ اگر وہ روٹھ گیا ہو تو اُس کو منا لائیں اور اُسی کو تخت پر بٹھائیں اور خود اُس کی خدمت کا شرف حاصل کریں۔ لیکن جب دیکھا کہ ہمارا بھائی اپنے عہد پر مضبوط ہے اور جب تک چودہ۱۴ برس گزر نہ جائیں گے کبھی وطن واپس نہیں آسکتا، تو پھر نہایت خوشی اور مسرت دلی سے (نہ کہ مایوسی سے) اپنے بڑے بھائی کی کفش پا، یعنی کھڑاؤں نہایت تعظیم و تکریم سے لے کر اپنے سر آنکھوں پر چڑھائی اور بھائی کے بجائے اُسی کو تختِ سلطنت کی مسند شاہی پر رکھ دیا اور خود اُس کے سامنے کمر بستہ اور دست بستہ کھڑے ہو رہے

اور سلطنت کا کام، مشیروں اور وزیروں کی مانند، خادموں اور غلاموں کی طرح، بخوبی تمام، اُس وقت تک انجام دیتے رہے، جب تک صادق الاقرار رام چودہ برس گزار کر، جنگل سے واپس آئے۔

بھائیو اور بہنو! ہمارے کرۂ ارضی کی پیدائش کو دو ارب اور چار سال شمسی گزرے ہیں، جو ڈاکٹر مولٹن کے حساب سے مطابق ہیں، جو کہ یورپ میں سب سے بڑا جھندرس گزرا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت ایسا سعادتمند فرزند ارجمند پیش کرسکتی ہے، جیسے کہ شری رام چندر جی تھے؟ کیا زمانے میں کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت اس مدت دراز میں ایسی عالی قدر، عالی منزلت اور شوہر پرست خاتون دکھا سکتی ہے، جیسی کہ شری سیتا مہارانی تھیں؟ کیا کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت، اس دو ارب کے زمانۂ دراز میں ایسے محبت کرنے والے اور جاں نثار بھائی بتا سکتی ہے، جیسے کہ شری رامچندر جی کے بھائی لچھمن جی اور بھرت جی تھے؟ ہرگز نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ زمانہ قیامت تک خود کف افسوس ملتا رہے گا کہ افسوس میں نے ایسے بے نظیر اور عدیم المثال لوگوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔

صاحبان والا شان! میں شری رام چندر جی کے عشق میں ایسا متوالا اس وقت ہو گیا کہ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ ہمارے مہمان عظیم الشان، عالی جناب پروفیسر صاحب لکچر دینے کے لیے اس بزم سخن میں رونق افروز ہیں اور آپ سب لوگ اُن کی تقریر دلپذیر سننے کے شائق ہیں۔ میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔

میری تقریر طول کھینچ گئی ۔ اب میں آپ سب بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپ پروفیسر صاحب کا کلام فصاحت نظام بگوش دل سنیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اُن کی پوری داد دیں گے اور ہماری بہنیں بھی جو کہ خوش قسمتی سے اس جلسے میں شریک ہیں، راماین کی مذہبی اور اخلاقی داستانوں کو بڑے شوق اور دلچسپی سے سنیں گی ۔ اب میں جناب پروفیسر صاحب کی خدمت عالی میں بادب عرض کروں گا کہ پلیٹ فارم پر تشریف لائیں اور سامعین باتمکین کو اپنی جادو بیانی اور شیوہ زبانی سے محظوظ فرمائیں ۔

علمائے اسلام کا شکریہ

نومبر ۱۹۰۸ء میں، مدرسہ مفتی صاحب میں بیرونجات سے بہت سے علمائے دین تشریف لائے اور مختلف موضوعات پر انھوں نے وعظ کیے۔ نہایت لطف کا جلسہ تھا۔ اہل ہنود بھی شریک تھے۔ مشران صاحب بھی مدعو کیے گئے تھے۔ جلسہ کئی روز رہا۔ آخری جلسے میں احباب کی فرمائش پر مشران صاحب نے تمام ہندو مسلمانوں کی طرف سے علماء کا شکریہ حسب ذیل الفاظ میں ادا کیا:۔

حضرات علمائے ذوالامجاد اور مسلمانان فرخ آباد!

اس وقت میں اپنے احباب کی فرمائش سے، جن میں ہندو مسلم بھائی دونوں شامل ہیں، علمائے دین کا خاص طور پر شکریہ دلی ادا کرتا ہوں، جنھوں نے دور و دراز مقامات سے یہاں قدم رنجہ فرماکر اس جلسے کو رونق بخشی ہے اور ہم کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض فرمایا ہے۔ فرخ آباد کے نہ صرف مسلم بھائی بلکہ ہنود بھی میزبان ہیں اور بیرونجات سے جو حضرات تشریف لائے ہیں وہ ہمارے مہمانان ذیشان ہیں۔

حضرات! یہ علمائے دین جو تشریف رکھتے ہیں مذہبی ہادی ہیں، جو آپ کو خدا پر ایمان رکھنے اور اُس پر مضبوط رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہ

اصل میں اُن عالموں کے جانشین ہیں جو عروج اسلام کے وقت دین و دنیا دونوں کے پیشوا تھے، یعنی یہ لوگ آپ کو صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے، بلکہ آپ پر حکومت بھی کرتے تھے۔ یہی قاضی تھے اور یہی مفتی۔ مسلمانوں کو یہ فخر ہمیشہ رہا ہے کہ اُن کے عالموں نے مال و دولت کو کبھی کچھ مال نہیں سمجھا، بلکہ علم اس غرض سے حاصل کیا کہ اپنے دین کو سمجھیں اور اُس پر عمل کرنے کی قوت حاصل کریں۔ علماء کا ایک گروہ ایسا گزرا جو دولتمند نہ تھا۔ مُلّا شاہ نظام الدین، مُلّا کمال، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالحق کو، کب دولت و ثروت حاصل تھی۔ بعض طلبہ نے نہایت افلاس کی حالت میں تحصیل علم کی اور ایک ایک حدیث جاننے کے لیے ہزاروں کوس کا سفر اختیار کیا، بلکہ ایک ایک اعراب کی تحقیق کے واسطے تمام قبائل عرب کے دروازوں پر گئے اور عرب کے بیابانوں کی خاک چھانی۔ میں آپ کی اجازت سے چند بزرگوں کا حال بیان کروں گا، جنھوں نے افلاس کی حالت میں تحصیل علم نہایت شوق اور محنت سے کی اور بڑے بڑے سفر اختیار کیے، تاکہ آپ کو بھی اُن کی ریس کرنے کا شوق دامنگیر ہو۔

حافظ الحدیث، حجاج بغدادی نے جب تحصیل علم کے لیے سفر اختیار کیا تو اُن کی ماں نے توشہ سفر کے طور پر سَو کلچے پکا کر اُن کے حوالے کیے۔ حجاج نے سالن خود مہیا کر لیا، یعنی دریائے دجلہ کا پانی۔ ایک روٹی روز دجلے کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے تھے اور اُستاد کے حلقۂ درس میں داخل ہو کر پڑھا کرتے تھے۔ جب روٹیاں ختم ہو گئیں تو افلاس کے باعث چقندر کے پتے کھا کر

بسر اوقات کی۔ امام بخاری نے طلب علم میں ایک طویل سفر اختیار کیا اور افلاس نے ایسا مجبور کیا کہ تین روز برابر جنگل کی بوٹیاں کھاتے رہے، مگر اسی ذوق علمی کی بدولت امام بخاری کہلائے۔ ان کو سفر موجب ظفر ہوا، جو معمولی آدمیوں کو بصورت سقر دکھائی دیتا ہے ؎

دنیا میں ہے مَثَل کہ سفر صورتِ سقر
لیکن ہوا وہ اُن کے لیے موجب ظفر

سچ کہا ہے ؎

سفر مربی مرد است و آشیان خطر
سفر خزانہ مال است و اوستادِ ہنر

بشہر خویش دروں بے خطر بود مردم
بہ کان خویش دروں بے شرف بود گوہر

درخت اگر متحرک بدے زجائے بجائے
نہ جورِ ارّہ کشیدے و نے جفائے تبر

ابو حاتم رازی جو فن حدیث کے بڑے عالی مرتبہ امام تھے، اپنا حال پُرملال خود لکھتے ہیں کہ میں زمانۂ طالب علمی میں چودہ برس بصرے میں رہا۔ ایک مرتبہ افلاس کی بدولت کپڑے بھی بیچ کھائے، پھر دو دن بھوکا رہا۔ ایک دوست میرا جو اس حال سے واقف ہو گیا تھا اور جس کے پاس صرف ایک اشرفی تھی، اُس نے نصف مجھے دے دی۔

شیخ الاسلام ابو العلائے ہمدانی کا حال سنیے۔ اُن کو لوگوں نے بارہا دیکھا کہ مسجد کے چراغ کے نیچے، جو کسی قدر بلندی پر تھا، کھڑے کھڑے کچھ لکھ رہے ہیں۔

حکیم ابو نصر فارابی سے دنیا واقف ہے، جو معلّم ثانی کہلایا اور ارسطو کے برابر سمجھا گیا۔ یہ شخص بقول ایک انگریز مورخ کے بہتّر زبانیں جانتا تھا۔

زمانۂ طالب علمی میں اُس کے افلاس کی یہ حالت تھی کہ چراغ کے لیے تیل نہیں تھا، لہذا پاسبانوں کی قندیلوں سے رات میں کام لیتا تھا۔ آخر میں جو مرتبہ پایا وہ ظاہر ہے۔

ابوالعباس رازی حافظ الحدیث مادر زاد نابینا تھے، مگر اپنے نبیؐ برحق کے اقوال و افعال جاننے کے اس قدر شیفتہ تھے کہ بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر پیادہ پا اختیار کیا۔ جن لوگوں کو خدا نے دو آنکھیں دی ہیں، اُن میں سے کتنے ہیں جو ایسی مذہبی دلچسپی رکھتے ہیں۔

صاحبو! انتہائی ذوق علمی کی دو ایک مثالیں اور آپ کی خدمت میں عرض کروں گا۔ ابوالبرکات جو مشہور و معروف طبیب گزرے، وہ اوائل میں موسوی ملت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے چاہا کہ ابوالحسن طبیب کے حلقۂ درس میں داخل ہوں۔ اِن کے آستانے پر آئے، تو انھوں نے پڑھانے سے انکار کر دیا اور وہ یہاں سے ناکام بے نیل مرام واپس چلے گئے۔ گویا زبان حال میں یہ کہہ رہے تھے ؎

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم　　ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

—— اُن کو ایک تدبیر سوجھی، یعنی یہ کہ ابوالحسن کے دربان کی خوشامد کرلی۔ اُس نے دروازے پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ جب ابوالحسن شاگردوں کو درس دیتے تھے تو یہ بھی آستانے پر بیٹھ کر ان کے درس سے فیض حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ ایک سال کامل دروازے پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔ ایک دن کسی مسئلے میں، ابوالحسن ایسے اُلجھے کہ وہ عقدہ مالاینحل حل نہ ہو سکا۔ ابوالبرکات

اُس کا حل جانتے تھے - فوراً دلیری سے اُستاد کے رو برو حاضر ہو کر کہنے لگے کہ اجازت ہو تو میں بھی کچھ اس مسئلے میں عرض کروں - جب اجازت ملی تو اس کو جالینوس کے قول سے حل کر دیا اور کہا کہ حضور ہی نے ایک دن اسی مسئلے کو اس طرح حل فرمایا تھا - ابو الحسن نے حیرت سے پوچھا کہ تم نے میرا بیان کہاں سنا - ابو البرکات نے صورتِ واقعہ بیان کی - اُسی وقت استاد نے اُن کو اپنے حلقۂ درس میں داخل کر لیا، یہ کہہ کر کہ ایسے شیفتۂ علم و فن کو علم سے محروم رکھنا حرام ہے -

ابو بکر بن بشار جو بہت بڑے ادیب گزرے، بغداد میں شہزادوں کے اتالیق تھے - ایک دن جبکہ وہ خلیفہ کے ایوان خلافت کی طرف جا رہے تھے راستے میں ایک کنیز کو دیکھا جو بکنے کے لیے نخاس میں آئی تھی اور حسن و جمال میں بے نظیر تھی - یہ عالم تھا کہ ؎

بہ ابرو کمان و بہ گیسو کمند ... بہ بالا بہ کردار سروِ بلند
ہمہ عارضش گل، ہمہ چشم خواب ... ہمہ لب پر از مے بوئے گلاب
دو برگ گلش سوسن مے سرشت ... دو شمشاد و عنبر فروش از بہشت

یہ اس کو دیکھنے میں ایسے محو ہوئے کہ کار منصبی انجام دینا بھی بھول گئے - جب وقت معینہ کے بعد ایوان خلافت میں پہونچے تو خلیفہ نے پوچھا کہ آج دیر کا کیا باعث ہوا؟ ابو بکر نے کنیز حور نژاد کا حال بیان کیا - خلیفہ نے ابو بکر سے چھپکر ملازموں کو حکم دیا کہ اُس کنیز کو خرید کر، ابو بکر کے مکان پر پہونچا دو - چنانچہ جب ابو بکر گھر واپس آئے تو اُس کنیز کو اپنے یہاں موجود پایا - دریافت

کرنے پر حقیقت حال معلوم ہوگئی - اُس کنیز کو بالاخانے پر بھیج دیا اور خود ایک علمی مسئلے کے حل کرنے میں مصروف ہو گئے مگر حال یہ تھا کہ ع دل اُس کی طرف نظر کہیں اور -- چنانچہ طبیعت بہت مکدر ہوئی اور ملازم سے کہا کہ اس دلفریب عالم کو نخاس میں پہونچادو - میرا دل اس کے مقابلے میں علم کی طرف زیادہ مائل ہے - چنانچہ وہ کنیز نخاس واپس پہونچادی گئی -

صاحبو! علم و ہنر کچھ نبوت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوگئی - نہ یہ فلسفہ وحکمت ہے، جس کا خاتمہ ارسطو اور فارابی پر سمجھا جائے، بلکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اکتساب، محنت اور جد وجہد سے ہوسکتا ہے ؎

فیض روح القدس ارباز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

حافظ ابو عبد اللہ اصفہانی نے ایک مرتبہ اُن مقامات کے نام بیان کیے، جہاں جہاں وہ حدیث سیکھنے کی غرض سے گئے تھے - طوس، نیشاپور، جرجان، سمرقند، بخارا، بلخ، کرمان، ہرات اسی طرح وہ ایکسو بیس [۱۲۰] مقامات کے نام لیتے گئے - زرا غور فرمائیے کہ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے ایکسو بیس [۱۲۰] مقامات گنا لائے تو ہم سنتے سنتے اُکتا جائیں گے اور گھبرا اُٹھیں گے - ہزار آفریں اُس باہمت شخص کو، جو ایک سو بیس مقامات کے سفر کرنے سے نہ اُکتایا اور نہ گھبرایا - صاحبو! اسی طرح سیکڑوں بلکہ ہزاروں عالموں کے حالات ہیں جن کے بیان کرنے کے لیے کئی روز درکار ہیں - آخر میں میں آپ حضرات کی تشریف آوری کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں -

موتی کی خدمت میں خیر مقدم کے ہار

فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو بعض عمائدین کی دعوت قبول فرماکر، فرخ آباد تشریف لائے اور ایک جلسۂ عام تلک بھون، میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ سارے ضلع کے حضرات، جو پنڈت جی کے شائق دیدار ہیں، اس موقع پر ان کی زیارت سے مشرف ہو جائیں۔ مشران صاحب نے جلسۂ مذکور میں حسب ذیل تقریر فرمائی :-

صدر جلسہ اور حاضرین انجمن!

اولاً میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ کو قوم کے گرانبہا گوہر یعنی پنڈت موتی لال صاحب نہرو کی خدمت میں خیر مقدم کے ہار پیش کرنے کے لیے انتخاب فرمایا اور یہ خدمت سپرد کر کے میری آبرو بڑھائی - گو کہ میری شخصیت ایسی نہیں کہ موصوف جیسے عظیم المرتبت انسان کو خوش آمدید کہنے کی جسارت کروں، مگر بنحوائے المامور معذور اس کار خیر کو اپنے لیے فال نیک سمجھ کر بصد شکریہ و امتنان قبول کرتا ہوں ——— صاحبان والا شان! سہ

روز عیش و طرب و بادہ و جام است امروز
کام دل حاصل و ایام بکام است امروز

انچہ می خواستم از حضرت باری شبہا
للہ الحمد کہ حاصل بتمام است امروز

حضرات! یہ وہ مبارک گھڑی ہے، جس میں اہل فرخ آباد اور اطراف و اکناف کے خاص و عام کی، دلی تمنا بر آئی - ایک مدت سے یہ حسرت دل میں

تڑپ تڑپ کر کروٹیں لے رہی تھی کہ رہنمایان قوم کی مالا کا یہ انمول موتی اور زمین ہند کے خزانے کا یہ بیش قیمت لال، جس کا لال بھی بھارت ماتا کی تھیلی کا ایک گرانقدر جواہر ہے، ہمارے وطن (فرخ آباد) کی خاک کو اپنے پاک قدموں سے عزت بخشے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ہماری یہ حسرت بر آئی اور اس لعلِ شب چراغ نے ہمارے اندھیرے دل کی بستی میں اُجالا کر دیا۔

پنڈت جی! آپ نے فرخ آباد کی سرزمین کو قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرما کر جو عزت ہم لوگوں کو بخشی ہے اس کے شکریے سے ہماری زبان قاصر ہے۔ جناب والا کی تشریف آوری سے جو بے پایاں خوشی ہم کو حاصل ہوئی وہ الفاظ کے تنگ جامے میں نہیں سما سکتی۔ بس ع دل من داند و من دانم و داند دل من ــــ البتہ اتنا افسوس ہے کہ ہم اپنی بے مائگی کے باعث، آپ کی شان کے مطابق لوازم استقبال مہیا نہ کر سکے۔ حق یہ ہے کہ جو کچھ آرائش ہم لوگوں نے کی ہے، آپ کی ذات والا صفات جو علم و عمل کے زیورات سے آراستہ ہے، اس آرائش سے کہیں بالاتر ہے، تاہم اس جلسے کو ایک امتیاز حاصل ہے، جس پر اہل فرخ آباد بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں اور دوسری جگہ کے لوگوں کو یہ فخر نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ امتیاز یہ ہے کہ یہ استقبالی جلسہ ایسے متبرک مقام میں منعقد ہوا ہے، جو پیشوائے قوم اور فدائے ملک، مہاتما تلک کے نام نامی اور اسم گرامی سے منسوب ہے۔ وہ مہاتما تلک جو ہمارا اور ہماری قوم کا سچا بہی خواہ اور بھارت ماتا کا ویر سپوت تھا اور جس کا یہ زریں مقولہ سونے کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے اور

ہمارے پنڈت جی کی لوحِ دل پر بھی کندہ ہے کہ ــــ "سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اس کو ضرور حاصل کروں گا۔"

عہد قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ استقبال کے موقع پر مقررین اپنے میہمان کی مدح سرائی میں تر زبان ہونا فرض سمجھتے ہیں، مگر میں اس کے بجائے موصوف کے نفس الامری اوصاف بیان کرنے پر اکتفا کروں گا، جس سے ہمارے نوجوانوں کو، جو اس جلسے میں شریک ہیں، سبق حاصل ہو اور وہ بھی آپ کے نقشِ قدم پر گامزن ہونے کی کوشش کریں۔

ہمارے پنڈت جی جس زمانے میں وکالت کرتے تھے، اُس وقت آپ ہائی کورٹ کے ایک منتخب اور متفرد ایڈوکیٹ تھے۔ اگرچہ آپ کو اس پیشے میں لاکھوں کی آمدنی ہوتی تھی مگر جن کا ظرف عالی ہوتا ہے وہ مال و زر کو ہاتھ کا مَیل سمجھتے ہیں اور کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس سے بنی نوع انساں کو فائدہ پہونچے۔ چنانچہ پنڈت جی نے جب یہ دیکھا کہ ان کا وطن اور قوم ایک ایسے خطرناک اور پُرخار راستے سے گزر رہے ہیں جس کے نشیب و فراز سمجھنا عوام کا کام نہیں، تو دردِ وطن سے بیچین ہو کر اس پیشے کو ترک کر دیا اور ملک کو سوراج دلانے کی وکالت فرمانے لگے۔ آپ مظلوموں کی فریاد سننے والے، غریبوں کی مدد کرنے والے، بیکسوں کے پشت پناہ، بیماروں کے چارہ ساز، ملکی اور قومی آزادی کے علمبردار اور ہمارے حامی و مددگار رہیں اور ایسی تحریکوں میں، بغیر کسی جاہ و مال کی خواہش کے، سب سے پیش پیش رہتے ہیں جس طرح ابراہیم ادہم نے راہِ خدا میں تخت و تاج پر لات مار دی تھی، اسی طرح آپ نے بھی

ہماری خاطر عیش و آرام کو ٹھکرا کر، لاکھوں روپئے کی آمدنی پر خاک ڈال دی اور ذاتی منفعت پر قومی فلاح کو ترجیح دے دی - حق یہ ہے کہ راحت و آرام کو چھوڑ کر دوسروں کے رنج میں شریک ہونا، اپنی تکلیف کا احساس نہ کر کے دوسروں کا غم بٹانا، آپ نے اپنا شیوۂ عمل اور طریقۂ کار بنا لیا ہے -

سامعین با تمکین! اس وقت جو سودیشی کی تحریک، سارے ہندوستان میں ہمارے سیاسی دیوتا مہاتما گاندھی کی کوشش سے ترقی پذیر ہے، پنڈت جی موصوف اس کے فقط زبانی ہی مؤید نہیں بلکہ پورے طور پر اس کے عامل ہیں- اگرچہ آپ پہلے ولایتی کپڑا اور انگریزی لباس استعمال کرتے تھے لیکن اب دیسی کپڑا اور ہندوستانی پوشاک زیب تن فرماتے ہیں - بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سادھوؤں کے جلوس میں جلوہ گر ہیں- آپ کے دلی جذبات آپ کے لباس سے ظاہر ہیں -گویا یہ شعر آپ ہی کے لیے کہا گیا ہے ؎

ادراک حال ما زنگہ می تواں نمود　　حرفے زحال خویش بہ سیما نوشتہ ایم

صاحبان والاشان! بندوں پر خداوند عالم کی یہ بہت بڑی مہربانی ہے کہ وہ مصلحت زمانہ کے مطابق اپنے خاص بندوں کو عام لوگوں کی اصلاح اور بہبود و فلاح کے لیے مقرر کرتا رہتا ہے - چنانچہ جس طرح راجا رام موہن رائے، بابو کیشب چندر سین، سر سید اعظم اور سوامی دیانند جی اپنے اپنے کارہائے خاص کے واسطے منتخب ہوئے تھے، اسی طرح ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے مہاتما گاندھی اور ہمارے مہربان پنڈت جی موصوف مقرر ہوئے ہیں -

جناب والا! ہم سب ایک مدت سے آپ کی زیارت کے خواہشمند اور آپ کی دید کے صمیم قلب سے متمنی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا پرخلوص انتظار اور سچی محبت کی کشش ہی آپ کو یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ لہٰذا اگر آپ اجازت دیں تو نہایت ادب سے یہ عرض کروں کہ ؎

مرا، ز آمدن خود مدار، منت دار
کہ ایں نتیجۂ ایام انتظارِ من است

معزز حاضرین! ہمارے پنڈت جی کی گرانقدر خدمات اور ان کے عظیم کارناموں سے کون واقف نہیں۔ آپ ہندوستان کے تمام صوبوں میں، بلکہ اطراف واکناف عالم میں بھی اسی قدر مشہور ہیں جس قدر اپنے صوبۂ آگرہ و اودھ میں شہرت رکھتے ہیں۔ جب پنجاب میں شورش برپا تھی اور دار وگیر کا بازار گرم تھا، اُس وقت آپ وہاں تشریف لے گئے اور ذاتی زر و دولت اور وقت و فرصت کا نہایت خندہ پیشانی اور فراخدلی سے ایثار کیا اور ایک مدت تک، وہاں رہ کر، ایسے واقعات تحقیق فرمائے جو ہنٹر کمیشن کو نہ معلوم ہو سکے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس وقت سے پنجاب کا بچہ بچہ اس محسن کا نام عظمت سے لیتا ہے۔ اس واقعے کے بعد ہی، اہل پنجاب نے اعترافِ امتنان کے طور پر آپ کو امرتسر کانگریس کا صدر منتخب کیا۔ وہ کانگریس جس کا صدر ہندوستان میں بے تاج کا بادشاہ، سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی خدمات ہیں جن کا معاوضہ سوائے اس کے کہ اہل قوم اپنا دل آپ کے قدموں میں نثار کر دیں، اور کچھ نہیں ادا ہو سکتا اور اس سے

زیادہ ہم غلاموں کے پاس اور کچھ دھرا ہی کیا ہے جو ایسے محسن کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

اب میں اپنی تقریر کو ختم کر کے پنڈت جی سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی تقریر دلپذیر سے مجمع کو محظوظ فرمائیں اور ہماری راہ میں چراغ ہدایت جلائیں۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی فتح

ماہ مارچ ۱۹۲۲ء میں جبکہ تُرک، دوبارہ فتحیاب ہوئے، تو گھمنا کی نئی جامع مسجد میں بوقت شام مسلمانوں کا جلسہ عام اس غرض سے منعقد ہوا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کو اُن کی فتح کامل پر مبارکباد دی جائے اور آئندہ فتوحات کے واسطے دعا مانگی جائے۔ اول چند مسلم حضرات کی تقریریں ہوئیں۔ بعد ازاں مشران صاحب نے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر کی:-

بھائیو! کل جلسۂ عام میں، جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے، دو باتیں طے ہوئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندو آج اپنے مندروں میں فتح مسلمین کی دعا مانگیں اور دوسری یہ کہ تمام ہندوؤں کی طرف سے مجھے اس جامع مسجد میں بھیجا جائے کہ میں مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہندوؤں کی طرف سے دعا میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں اور اس وقت اس متبرک جگہ پر ہندوؤں کی نیابت میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو اُن کی نمایاں کامیابی پر مبارکباد، بادلِ شاد دیتا ہوں اور اُس احکم الحاکمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس نے مسلمانوں کو فتح کرامت کی اور اسلام کی عزت اور خلافت کی حرمت، تمام دنیا میں قائم رکھی۔ اب ہم آئندہ کی فتوحات کے واسطے

دعا مانگیں۔ اس عرصے میں جو خبریں موصول ہوئیں وہ یہ ہیں کہ یونانیوں نے درّۂ دانیال کے کنارے، بہت سے اضلاع خالی کردیے اور پندرہ ہزار سپاہی جو بہت زیادہ زخمی ہوئے تھے اُن کو جہاز پر سوار کرا کے بھاگ نکلے۔ یونانی فوج کا سپہ سالار گرفتار ہوگیا ہے اور بہت سے یونانی جنرل بھی گرفتار ہوئے ہیں، جن کو ترکوں نے اپنے بڑے بڑے فوجی مقامات پر بھیج دیا ہے۔ وہاں وہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے مہمان ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجیے، کس قدر فیاضی اور مہربانی اور برادری کا برتاؤ مسلمان کا اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ ہے۔ اس وقت جہاں جہاں مسلمان ہیں، ہر جگہ وہ جنگ کی حالت میں ہیں۔ ترک اپنے دشمنوں سے آسٹریلیا اور سلیشیا وغیرہ میں لڑ رہے ہیں۔ شام اور عراق عرب میں مسلمان اپنی حکومت خود اختیاری قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مصر اپنی پوری خود مختاری کے واسطے کوشاں ہے اور ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان خلافت کے معاملے میں کس قدر گورنمنٹ ہند کے ساتھ ترک موالات کرنے پر آمادہ ہیں، غرضکہ تمام دنیائے اسلام سیاسی جد و جہد میں مصروف ہے۔ خدا کرے، یہ سعی مشکور ہو۔

اس جنگ میں دنیائے اسلام کے علاوہ روس کی امداد بھی شامل ہے، جو ٹرکی کا حلیف ہے۔ روس اور ٹرکی کے عہدنامے کی تفصیلات وہ حضرات جانتے ہیں جو اخبارات پڑھتے رہتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء کے ستمبر میں بمقام باکو جو سلطنت آذربائیجان کا دارالحکومت ہے، اسلامی ملکوں کے وُکلاء جمع ہوئے تھے اور یہ طے پایا تھا کہ ایشیا کی تمام قوتیں مل کر برطانیہ کے خلاف متفقہ کوشش

کریں - اُس وقت سلطنت روس نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ خودمختاری حاصل کرنے میں ہم مدد دیں گے - چونکہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو یہ امر بہت ناگوار تھا کہ ترکوں کے مقبوضہ ممالک، یونانی سلطنت کے محکوم رہیں، اس لیے اس تحریک میں وہ "مخالفت برطانیہ" کے لیڈر بن گئے - اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں اسلام کو آزاد کرنے کے واسطے بمقام انگورہ، لیگ کی کمیٹی بیٹھی، جس کے میر مجلس خود مصطفیٰ کمال پاشا تھے - کمیٹی کے اختتام پر مصطفیٰ کمال نے اعلان کیا کہ ہم اسلام کو متحدہ سلاطین سے آزاد کریں گے اور یہ بھی کہا کہ مشرق میں جس قدر مذہبی کوشش ہے اور ترکی قوم پرستوں کی جو تحریک ہے وہ سب سلطنت روس کی امداد سے ہے - مصطفیٰ کمال کی جو کوشش ہے وہ محض اس غرض سے ہے کہ ترکوں کو غلامی سے آزاد کریں جو بموجب عہدنامے کے اُن پر عائد ہوتی ہے -

صاحبو! آج جو اس مقدس مقام میں ہندو مسلم بھائی سب متحد اور مشترک غرض سے جمع ہو کر خوشی منا رہے ہیں، یہ مسئلۂ خلافت کی بدولت ہے جس میں ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے ہیں - اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندوستان میں بھی اسلام غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور ہندو مسلم بھائی سب مل کر حکومت خوداختیاری یعنی سوراج حاصل کریں گے - یاد رکھنا چاہیے کہ ہم ہندوؤں کے تعلقات آپ مسلمانوں کے ساتھ صرف اُس وقت سے نہیں ہیں، جب سے کہ آپ سب ہندوستان میں آ کر ہمارے مہمان ہوئے، بلکہ منصور عباسی خلیفہ بغداد کے وقت سے ہیں جس کو ساڑھے گیارہ سو برس کا عرصہ گزر گیا -

اس سے پہلے بھی قریش اور ہنود کے تجارتی تعلقات تاریخ عرب سے ثابت ہوتے ہیں۔ منصور کے وقت میں اور خلیفہ ہاروں رشید اور ماموں رشید کے زمانے میں، بہت سے برہمن، جو مختلف علوم و فنون کے ماہر تھے، بغداد میں بلائے گئے تھے۔ اُنھوں نے وہاں جاکر عربی علوم میں دستگاہ حاصل کی اور نجوم، ویدک، فلسفہ، مذہب، اخلاق، جنگ و حرب اور علوم ریاضی کی تصنیفات جو سنسکرت میں تھیں، اُن کا ترجمہ عربی زبان میں کر دیا۔ اُس وقت ہندو راجاؤں مہاراجاؤں سے بغداد کے خلفاء کی خط و کتابت رہا کرتی تھی اور بڑے دوستانہ مراسم باہم تھے۔ اُس زمانے میں بہت سے مسلمان ہندوستان آئے اور اُنھوں نے سنسکرت زبان میں بڑا ملکہ حاصل کیا اور بغداد جاکر ہندوؤں کے ویدانت پر عربی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ایک نایاب کتاب ہمارے یہاں کی تصنیف سے، جس میں زہروں کا علاج تھا، بغداد لے گئے۔ اُس کا ترجمہ بھی عربی زبان میں ہوا۔ اُن مسلمانوں میں ایک شخص یعقوب کندی تھا، جو سنسکرت کا ایسا فاضل تھا کہ یہ زبان نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بول سکتا تھا۔ اُس نے ہندو شاستر اور دیگر کتب مذہبیہ کا ترجمہ کیا ہے اور بغداد میں فیلسوف کے لقب سے اب تک مشہور ہے۔ وہ ماموں رشید کے دربار کا سب سے بڑا فاضل اجل اور مترجم سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ خلافت کے علاوہ ایک دوسرا سبب اور پیدا ہو گیا، جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں حقیقی بھائیوں سے زیادہ اتحاد و ارتباط پیدا ہو گیا ہے۔ میرا مطلب شاہ کابل کے فرمان شاہی سے ہے، جس میں بڑے بڑے عالموں

اور مفتیوں اور قاضیوں کے فتووں کا حوالہ دے کر گاؤکشی بند کرنے کی ہدایت کی گئی ہے محض ہندو بھائیوں کی خاطر سے کہ اُن کا دل نہ دُکھے اور مسلمان اور ہندو تمام ملک میں شیر و شکر ہو جائیں۔ شاہ افغانستان اور قاضیوں اور مفتیوں کی تعریف تو جس قدر کی جائے کم ہے، مگر ہم اُس مسلمان رعایا کی تعریف بہت زیادہ کریں گے، جس نے اپنے بادشاہ کے حکم اور مفتیوں کے فتوے پر پورا عمل کیا اور ۳۱ کروڑ ہندوستانیوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ جناب رسول مقبول صلعم نے گائے کے بارے میں فرمایا ہے کہ "لحمها داءٌ ولبنها شفاءٌ" یعنی گائے کا گوشت بیماری ہے اور اُس کا دودھ صحت و تندرستی ہے۔ یہ مانا کہ اسلام میں گائے مباح[1] ہے مگر جو چیزیں مباح ہیں اُن میں ترک و فعل دونوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ خواہ اُن کو کوئی کھائے یا نہ کھائے۔ میں اس مسئلے پر زیادہ عرض نہ کروں گا کیونکہ ایسے مسائل میں غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔

اب میں مسلمان بھائیوں کی طرف پھر متوجہ ہوتا ہوں۔ پہلے ترکوں پر جو غلبہ یونانیوں کو ہوا تھا، اصل میں اللہ تعالیٰ کو ترکوں کے ایمان کی آزمائش منظور تھی۔ اُس امتحان میں ترک پورے اُترے اور خداوند تعالیٰ نے اُن کو پوری کامیابی دی، جس سے ظاہر ہوا کہ ترکوں میں جذبۂ اسلام موجود ہے۔ اسی طرح ہماری آپ کی آزمائش بھی اللہ تعالیٰ کر رہا ہے۔ ہم سب کو بھی ایمان میں مضبوط رہنا چاہیے۔ اُمید ہے کہ خلافت کا مسئلہ ہم سب کے حسب دلخواہ طے ہوگا۔ ہمارے مسلم بھائیوں کے سامنے جناب رسول مقبولؐ اور ائمہؑ اور

---

[1] وہ کام جس کو کر سکتے ہوں مگر کرنا ضروریات دین میں شامل نہ ہو۔

اصحابِ خیار کی مثالیں موجود ہیں - خود آپ کے بزرگ اور دادا پردادا کس قدر ایمان کے پکے تھے اور کس قدر اسلام کے فدائی تھے اور کس قدر اخلاق محمدیؐ اُن میں تھا - ابتدائے اسلام کا ایک تاریخی واقعہ سناؤں - ایک مرتبہ ایک تاجر کو تین لاکھ دینار کا منافع ہوا - امام وقت نے اُس سے کہہ دیا کہ یہ نفع جائز نہیں، حرام ہے - اُس تاجر نے وہ تمام دینار دریائے دجلہ کی ریت میں پھینک دیے - مورخ لکھتے ہیں کہ مدتوں وہ دینار دریا کے کنارے ریت میں پڑے رہے اور کسی نے نہیں اٹھائے، کیونکہ یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ یہ دینار منافع حرام کے ہیں - جو لوگ شریعت کے زیادہ پابند اور پرہیزگار تھے، اُنھوں نے دریائے دجلہ کی مچھلیاں کھانا چھوڑ دیں کہ مبادا کوئی مچھلی کوئی دینار نگل گئی ہو تو اُس مچھلی کا اور اُس کے بچوں کا کھانا ہم پر حرام ہے۔

حضرات! آیئے اب ہم سب باادب کھڑے ہو کر اُس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں دعا کریں، جو تمام دنیا کے بادشاہوں کا حاکم علی الاطلاق ہے۔

"یا الٰہی تو ترکانِ احرار اور ان کے پیشوا غازی مصطفیٰ کمال پاشا کو فتح پر فتح نصیب کر اور مسئلۂ خلافت کو ہندوستان کے مسلمانوں کے خاطر خواہ طے کر کے اسلام اور خلافت کا احترام تمام دنیا میں قائم کر دے ——— یا الٰہی تو ہم اہل ہند کو معزز قوم بنا اور غلامی سے آزاد کر - ہم کو وہ سچی آزادی دے جو انگریزوں کو خود حاصل ہے اور ہم کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچا - یا الٰہی تو ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کر اور ہم کو توفیق دے کہ ہم دونوں مل کر حقیقی بھائیوں کی مانند سوراج میں شریک ہوں اور باہم شیر و شکر ہو کر

اس ملک میں بسر کریں - یا الٰہی تو ہم کو توفیق نیک دے کہ ہم سب اپنے اپنے گھروں میں چرخے کو رواج دیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک متبرک چیز ہے اور سودیشی کے استعمال سے بدیشی کا بازار سرد کریں ——— یا الٰہی تو شہیدانِ پنجاب کی پاک روحوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، جنھوں نے اپنا خون بہا کر ہم کو سوراج کا راستہ بتایا ہے اور آزادی کی قربانگاہ پر قربان چڑھ کر ہم کو سبق سکھایا ہے ——— یا الٰہی تو حکام وقت کو توفیق نیک دے کہ وہ قوم پرستوں کی دار و گیر سے باز آئیں اور رعایا پروری اور معدلت گستری اختیار کریں - تو ان کی عقل کو راہ راست پر لا کہ وہ ایسا شاہانہ عمل اختیار کریں، جو عادل بادشاہوں کا شیوہ ہے ——— یا الٰہی تو ہمارے بادشاہ کو ہدایت کر کہ وہ ویسرائے اور گورنروں سے جواب طلب کرے، جنھوں نے ظلم و ستم سے رعایا کو درہم و برہم کر رکھا ہے اور ویسرائے کو توفیق دے کہ وہ خلافت کے مسئلے کو مسلمانوں کے حسب دلخواہ طے کرے اور رولٹ ایکٹ، پریس ایکٹ اور ڈیفینس آف انڈیا ایکٹ کو یکقلم منسوخ کر کے، سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دے، جس سے اہل ہند کا دل بھی شاد ہو جائے اور انگریزی حکومت کے حق میں بھی نہایت مفید ثابت ہو ——— یا الٰہی تو ہم کو توفیق دے کہ ہم انگریزی سلطنت کے ساتھ ترک موالات، پُر امن طریقوں سے کریں اور ملک میں فتنہ و فساد برپا نہ ہونے دیں اور بموجب ہدایت مہاتما جی اور علی برادران کے، کوئی ایسا خیال اپنے دلوں میں نہ آنے دیں، جس سے کسی قسم کی جسمانی تکلیف انگریزوں اور

حکام وقت کو پہونچے ——— یا الٰہی تو ہمارے اخلاق درست کر اور ہم میں اتفاق باہمی پیدا کر جس کی بڑی ضرورت ہے۔ تو ہم کو جرأت وہمت عطا کر اور ملک وقوم کی خاطر سرفروشی سکھا، جس کے بغیر نہ سوراج ہی مل سکتا ہے اور نہ مسئلۂ خلافت ہی خاطر خواہ طے ہو سکتا ہے ——— یا الٰہی ہم ہوں اور ہمارا ملک ہند ہو، ہم ہندو ہوں اور ہمارے بھائی مسلمان، ہم ہوں اور مہاتما جی اور علی برادران، ہم ہوں اور سوراج ع

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

قومی نعرہ ——— نعرۂ تکبیر۔

آموں کی نمایش

بتاریخ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۶ء ٹون ہال فرخ آباد میں آموں کی نمایش ہوئی اور کلکٹر ضلع کے زیر صدارت جلسۂ عام منعقد ہوا، جس میں عمائدین شہر کے علاوہ فتحگڑھ کے حضرات بھی شریک تھے۔ نمایش کمیٹی کی درخواست پر مشران صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج یہ پہلا موقع تاریخ فرخ آباد میں ہے کہ آموں کی نمایش کی جا رہی ہے۔ آم کے موضوع پر تقریر کرنا خاص و عام کا کام نہیں۔ یہ اُنھی لوگوں کا کام ہے جو شیریں زباں ہیں مگر محض احباب کے امتثال امر کے لیے جو کچھ میں جانتا ہوں، مختصراً عرض کروں گا۔ امید ہے کہ اس پھل کے ذکر سے آپ کی ضیافت طبع کر سکوں۔

واضح ہو کہ اس ضلع میں دو سو چھیالیس قسم کے آم ہوتے ہیں، جن میں سے بہت زیادہ میٹھے، عام پسند چھ سات قسم کے ہیں۔ بمبئی، ٹکاری، نودھا، گوپال بھوگ، چونسا، دسہری، برسے کی آمن۔ صرف ٹکاری ایسا ہے جو بنارس میں بھی ہوتا ہے اور وہاں وہ لنگڑا کہلاتا ہے۔ چونسا ابھی حال میں ہردوئی کے ضلع سے لایا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ درجے کا آم ہے۔ جس طرح

شام کا سیب، حلب کا انگور، دمشق کا شفتالو، مصر کا لیموں، خراسان کا ترنج مشہور ہیں، اسی طرح ہندوستان کا آم بھی معروف و مخصوص ہے۔ پھر ہندوستان کے مختلف مقامات کے آم اپنی اپنی جگہ زیادہ مقبول ہیں۔ مثلاً بمبئی کا ایلفینزو، لکھنؤ کا دسہری، ملیح آباد کا سفیدہ، میرٹھ کا فجری، بنارس کا لنگڑا، امروہہ کا ثمر بہشت اور لطیف علی والا، ہردوئی کا چوسا، فرخ آباد کا نودھا۔

فرخ آباد کے تین آم تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر سناتا ہوں۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے یہاں محمد خاں بنگش ایک معزز عہدۂ فوجی پر ممتاز تھے۔ یہ وہی نواب محمد خاں ہیں جو بانی فرخ آباد تھے۔ بادشاہ ایک دن شکار کے قصد سے باہر نکلے اور ہاتھی پر سوار تھے۔ محمد خاں خواصی میں بیٹھے تھے۔ بادشاہ نے ایک آم کھایا جو وزن میں آدھ سیر تھا۔ گٹھلی محمد خاں کو دی کہ اپنے وطن بھیج دو۔ محمد خاں نے وہ گٹھلی ازراہ تعظیم رومال میں رکھ لی اور اپنے بیٹے نواب قائم خاں کو فرخ آباد بھیج دی۔ قائم خاں نے حیات باغ میں، جہاں بالآخر نواب محمد خاں کا مقبرہ بنا، وہ گٹھلی بو دی۔ جب درخت تیار ہوا اور بور آنے لگا، اس وقت پیادوں کی ایک کمپنی اس درخت کی حفاظت کے لیے تعینات ہوئی۔ جب پھل لگنے کا وقت آیا تو تینس۳۰ سیر دودھ اس کی جڑوں کو روزانہ پلایا گیا۔ نواب مظفر جنگ نے قلم کے ذریعہ چاہا کہ درختوں کی افزائش ہو، مگر صرف ایک پیڑ جما۔ اس کا نام گولا رکھا گیا۔ نواب شوکت جنگ کے وقت میں حکیم مہدی علی خاں چھکلے دار محمدی واقع اودھ، فتحگڑھ میں مقیم ہوئے۔ حکیم صاحب کو وہ آم نواب نے بھیجے۔ انھوں نے کھا کر

فرمایا کہ میں نے ایسا میٹھا اور لذیذ آم تمام عمر نہیں کھایا اور اُس کی قلمیں طلب کیں - نواب نے اجازت دے دی - قلمیں دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ درخت کمزور پڑ گیا اور ایک سال کے اندر سوکھ گیا اور مارا گیا -

نودھا آم فرخ آباد میں دکن سے آیا - عنایت خاں ایک شخص فرخ آباد کے متوطن دکن کی کسی ریاست میں سواروں میں نوکر تھے - جب وہ رضا (چھٹی) پر وطن آئے تو اُس وقت ایک بڑی قسم کا آم وہاں سے اپنے ساتھ لیتے آئے - یہاں عزیزوں اور دوستوں کو نذر دیے - سب نے بہت تعریف کی اور کہا کہ اس کی قلم لاکر فرخ آباد میں لگانا چاہیے - جب عنایت خاں نوکری پر واپس گئے تو وہاں انھوں نے اُس کی قلمیں تیار کرائیں اور جب وطن واپس آئے تو بہت سی قلمیں ہمراہ لائے اور یہاں اپنے دوستوں کے باغوں میں نصب کرادیں - اس آم کا نام نودھا رکھا گیا اور عنایت خاں کے نام سے منسوب ہوا - چنانچہ یہ آم فرخ آباد میں نودھا عنایت خاں کہلاتا ہے -

تیسرے آم کا حال یہ ہے کہ ایک درخت کا آم بہت بڑا ہوتا تھا - وزن میں قریب سیر بلکہ سوا سیر تک دیکھا گیا - آموں کی فصل تھی - اتفاق سے گدھے اس درخت کے نیچے پھر رہے تھے کہ ایک آم ٹپکا اور گدھے پر گرا اور کسی ایسی جگہ لگا کہ ہلاکت کا باعث ہوا - اُس وقت سے وہ گدھا مار آم مشہور ہو گیا - گولا اور نودھا تو یہاں بہت مشہور ہیں مگر تیسری قسم کا حال معلوم نہیں کہ اب ہے یا نہیں -

صاحبان والا شان! پھلوں میں صرف آم ہی ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ باقی جتنے پھل ادنیٰ اور اعلیٰ ہیں سب مابین طعامین کھائے جاتے ہیں۔ غذاؤں کے بدرقے ہوا کرتے ہیں جن سے وہ جلد ہضم ہوتی ہیں یا ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پھلوں کے بھی بدرقے ہوتے ہیں۔ مثلاً جس طرح چاول کے بعد ناریل اور گوشت کے بعد انجیر کھانا اور خربوزے پر شربت پینا مفید اور مصلح ہے، اسی طرح آم پر جامن کھانے سے اُس کی اصلاح ہوتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آم پر دودھ مفید ہے۔ یہ صحیح نہیں، کیونکہ دودھ باوجودیکہ اصلاح کرتا ہے لیکن بلغم بڑھاتا ہے۔ آپ کے شہر میں ایک طبیب حاذق سید اکبر حسین نام مرحوم نامور حکیم تھے۔ وہ ہمیشہ آم پر جامن کھایا کرتے تھے۔

حضرات! آم صرف شیریں اور لذیذ میوہ ہی نہیں ہے، بلکہ بہت بکار آمد بھی ہے۔ جب وہ کچا ہے تو چٹنی، اچار، مربّے کا کام ایسا دیتا ہے کہ کوئی دوسرا پھل نہیں دے سکتا۔ سرکہ، عرق نعناع اور تیل، تینوں میں اس کی چٹنی اور اچار پڑتے ہیں اور کئی کئی طرح سے۔ کھٹائی جس کا دوسرا نام امچور ہے اس ملک میں ایک تجارتی چیز ہے، جو کچے آموں کو سُکھا کر بنائی جاتی ہے اور نہایت عمدہ تُرشی کی چیز ہے جو روزمرہ غریب و امیر کے باورچی خانے میں خرچ ہوتی ہے۔ کسی دوسری چیز کی کھٹائی اس کے مقابل کچھ بھی بکار آمد نہیں۔ بہت سے لوگ غریب آدمی آم کی گٹھلی بھون کر کھایا کرتے ہیں جو غذا کا کام دیتی ہے۔ پکے ہوئے آموں کا

رس جمع کر کے سکھایا جاتا ہے اور چکتیوں کی شکل میں بنا کر رکھ لیا جاتا ہے اور ہر موسم میں کھانے کی چیز ہے ۔ اس کا نام امرس ہے ۔

ہندؤوں کے یہاں آم کسی قدر پاک چیز سمجھی جاتی ہے ۔ تیوہاروں اور تقریبوں پر اس کے پتّوں کی بندھنواریں بنا کر دروازوں پر یا اور نمایاں منظروں پر لٹکائی جاتی ہیں اور آم کا پھل پوجا کے سامان میں بھی شامل ہوتا ہے ۔ جب آم کا درخت سوکھ جاتا ہے تو اس کی لکڑی ایندھن کا کام دیتی ہے اور بمقابلہ ڈھاک کے ہر موسم میں اور خصوصاً برسات میں جلانے میں زیادہ اچھی ہوتی ہے ۔ پرانا آم جس کو اوکھٹا آم کہتے ہیں عمارت کے کام بھی آتا ہے ۔ غرضکہ آم جب سرسبز ہوتا ہے تب پھل دینے میں انتہا درجے کا فیاض ہوتا ہے اور سوکھ جانے پر بھی اعلیٰ درجے کا بکار آمد ہے ۔ شاعر کا یہ مقولہ ع

گرت زدست بر آید چو نخل باش کریم

اس درخت انبہ پر پورا اطلاق کرتا ہے ۔ زمانۂ حال میں ڈاکٹروں نے تحقیق کیا ہے کہ اس کی چھال کئی طرح پر دوا کا کام دیتی ہے ۔ سَو سال گزشتہ سے امریکہ کے گرم خطوں میں آم کی کاشت کی گئی ہے جہاں کی زمین اس کے موافق سمجھی گئی ہے ۔

صاحبان والا شان ! میں نے آپ کی خدمت مبارک میں ہندوستان کے آم کے بارے میں عموماً اور فرخ آباد کے آم کے خصوصاً حالات عرض کیے ۔ چونکہ اس وقت آموں کی نمایش ہے اس لیے مجھے نمایش کا بھی

ذکر کرنا چاہیے - واضح ہو کہ نمایش کے ذریعہ تمام دنیا میں تمدن انسانی کو حیرت انگیز اور گوناگوں ترقیاں میسر آئی ہیں اور علوم و فنون اعلیٰ مرتبے پر پہونچ گئے ہیں -

نمایش کی دو قسمیں ہیں - ایک قومی دوسری بین الاقوامی - اگر بالفرض ہندوستان کے مصنوعات کی نمایش کی جائے اور غیر ممالک کی ساخت کی چیزیں اس میں داخل نہ کی جائیں تو وہ نمایش قومی ہوگی اور اگر ساتھ ساتھ غیر ممالک کے مصنوعات کو بھی شامل کیا جائے تو وہ نمایش بین الاقوامی ہو جائے گی - آج کل دونوں قسم کی نمایشیں کی جاتی ہیں، لیکن اعلیٰ درجے کے مہذب ممالک مثلاً برطانیہ، فرانس، جرمن وغیرہ میں زیادہ تر بین الاقوامی نمایشیں ہوا کرتی ہیں - قومی نمایش کا ایک نمونہ ہماری یہ نمایش بھی ہے، جس میں فرخ آباد کے ضلع کے آم جمع کیے گئے ہیں -

نمایش میں کاریگروں کو انعامات، تمغے اور سارٹیفکٹ دیے جاتے ہیں جس سے اُن کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے اور اکثر اُن کی بنائی ہوئی چیزیں قدر افزائی کے طور پر زیادہ قیمت میں لوگ خرید لیتے ہیں - جس سے اُن کا حوصلہ بہت بڑھتا ہے - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایجاد و اختراع کرتے رہتے ہیں اور صنعت کو ترقی ہوتی ہے - یورپ اور امریکہ میں یہ حال ہے کہ آج جو چیز ایجاد ہوئی وہ دوسرے سال استعمال سے خارج کرنے کے قابل سمجھی جاتی ہے کیونکہ وہی چیز ترقی یافتہ شکل میں اور نیز بہت زیادہ بکار آمد صورت میں دوسرے صناعوں کے

ذریعہ عالم وجود میں آجاتی ہے - ہزاروں ایجاد و اختراع کے لیے صناعوں کو "پے ٹنٹ" دیے جاتے ہیں اور ایک شۓ خاص کا موجد، جس نے "پے ٹنٹ" حاصل کیا ہے اُس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اُس کو روپیہ کمانے کا پورا پورا موقع حاصل ہوتا ہے - امریکہ کا ایک نہایت معروف و مشہور صناع تمام دنیا میں بے نظیر گزرا ہے - اُس کا نام مسٹر ایڈیسن تھا - مختلف ایجاد و اختراع کر کے اُس نے اپنے مصنوعات کے واسطے ایک ہزار "پے ٹنٹ" حاصل کیے تھے - حال میں اُس نے قضا کی - اسی طرح ممالک یورپ و امریکہ کے ہزاروں اشخاص صنعت و حرفت میں نہایت نام بر آوردہ گزرے ہیں جنھوں نے انسانی تمدن کے متن پر ایجاد و اختراع کے گراں قیمت حاشیے چڑھا کر اُس کو بہت بلند پایہ کر دیا ہے اور علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کر کے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں -

سنہ ۱۷۶۱ء میں انگلستان میں پہلی نمایش زیادہ تر آلات کشاورزی کی عالم وجود میں آئی اور کاریگروں کو انعامات تقسیم ہوئے - اس کے بعد سنہ ۱۷۹۸ء میں فرانس میں نیپولین کے حکم سے نمایشوں کا سلسلہ قائم ہوا، جس کو قومی نمایش کہنا چاہیے - اس وقت سے سنہ ۱۸۴۹ء تک گیارہ نمایشیں فرانس میں ہوئیں جو سب قومی تھیں - سنہ ۱۷۹۸ء میں ایک سو دس کاریگروں کے مصنوعات داخل ہوئے تھے اور سنہ ۱۸۴۹ء میں ۴۴۹۴ کی تعداد تھی - سنہ ۱۷۹۸ء میں فرانس نے ایک سونے کا تمغا

ایسے کاریگر کے لیے تجویز کیا جو اپنی ایجاد سے انگلستان کی صنعت و تجارت کو سخت صدمہ پہونچائے۔ سنہ ۱۸۴۹ء تک وہ قومی نمایشوں کا اس قدر دلدادہ تھا کہ جب یہ تجویز پیش ہوئی کہ غیر ممالک کے مصنوعات بھی داخل نمایش کیے جائیں تو وہاں کے وزیر صیغۂ تجارت نے خیال کیا کہ فرانس کے دشمنوں نے یہ تجویز پیش کرائی ہے۔ سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ تھا، جہاں نمایش عالم وجود میں نہ آئی ہو۔ ملک امریکہ میں دو نمایشیں نیویارک و واشنگٹن میں سنہ ۱۸۲۸ء اور سنہ ۱۸۴۶ء میں کی گئیں اور نہایت کامیاب رہیں۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں بین الاقوامی نمایش لندن میں بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ ہائڈ پارک میں نمایش کی اشیاء کے واسطے سر جوزف بیکسٹن نے ایک شیش محل تیار کیا تھا اور ایک قطعۂ زمین علحدہ دس لاکھ مربع فٹ کا مخصوص کیا گیا تھا۔ نمایش کا افتتاح ملکہ معظمہ وکٹوریہ نے کیا تھا۔ جو مصنوعات داخل نمایش ہوئے اُن کی قیمت کا اندازہ دو کرور سرسٹھ لاکھ اٹھائیس ہزار نَو سو چھتیس پونڈ تھا۔ (اس میں کوہ نور ہیرے کی قیمت شامل نہیں ہے) لیکن منافع بہت زیادہ ہوا جو قریب بتیس لاکھ کے تھا۔

اس کے بعد فرانس میں بین الاقوامی نمایش سنہ ۱۸۵۵ء میں ہوئی جس کا افتتاح شہنشاہ فرانس نے کیا اور بارہ ہزار کاریگروں کو تمغے دیے گئے۔ اس نمایش میں خاص بات یہ تھی کہ جس قدر اشیاء داخل نمایش ہوئیں وہ اُن صناعوں کی تھیں، جو زندہ تھے۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں

پانچ برس کی تیاری کے بعد فلیڈلفیا واقع امریکہ میں بہت بڑے پیمانے پر نمایش ہوئی، جبکہ امریکن آزادی (یعنی سوراج) کی سو برس کی سالگرہ منائی گئی۔ اس میں ساٹھ ہزار کاریگروں کو تمغے اور انعامات انواع و اقسام کے عطا ہوئے تھے اور دنیا کی سینتیس ۳۷ اقوام نے شرکت کی تھی۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں فرانس میں نہایت بڑے پیمانے پر بین الاقوامی نمایش ہوئی۔ اس کو چار کرور آدمیوں نے دیکھا۔ اس موقع پر فرانس اس قدر انتظام میں منہمک تھا کہ اس نے چند ملکی اور قومی مہمات کو ملتوی کر دیا تھا کہ مبادا نمایش کو نقصان پہونچے۔

ہندوستان میں وقتاً فوقتاً نمایشیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہیوٹ صاحب گورنر کے وقت میں بمقام الہ آباد جو نمایش ہوئی تھی وہ نہایت کامیاب رہی۔ نمایش کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حاکم وقت کسی صنعت و حرفت کی ترقی و اشاعت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو نمایش کے ذریعے سے فروغ روز افزوں اور ترقی گوناگوں حاصل ہوتی ہے ورنہ ترقی کی رفتار نہایت سست ہو جاتی ہے ؎

ہنر ہر کجا یافت شہرت تمام   بدولت خدائی بر آورد نام

آخر میں میں آپ سب اہل کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ صاحبوں نے ازراہ قدردانی و مہربانی اس موقع پر مجھے یاد فرمایا۔

ناشر

پنڈت جگموہن نراین مُشران

ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج - یو، پی-

۲۶ ۷ ونگفیلڈ پارک

لکھنؤ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ